یکم و ۱۶ فروری ۲۰۲۴ء | بسم اللہ الرحمٰن الرحیم | جلد نمبر: ۱۷ ۔ شمارہ نمبر: ۳۔۴

پندرہ روزہ

معارف فیچر کراچی

MA'ARIF FEATURE

مدیر: سیّد شاہد ہاشمی

نائب مدیران: منعم ظفر خان، سید سمیع اللہ حسینی، نوید نون ۔ معاون مدیران: غیاث الدین، محمد عمید فاروقی

ڈی ۔ ۳۵، بلاک ۔ ۵، فیڈرل 'بی' ایریا، کراچی ۔ ۷۵۹۵۰

فون: ۳۶۸۰۹۲۰۱۔۳۶۳۴۹۸۴۰ (۲۱۔۹۲)

برقی پتا: irak.pk@gmail.com، ویب گاہ: www.irak.pk

۱ ۔ **معارف فیچر** ہر ماہ کی یکم اور سولہ تاریخوں کو شائع کیا جاتا ہے۔ اس میں دنیا بھر سے (ہمیں) دستیاب ایسی معلومات کا انتخاب پیش کیا جاتا ہے، جو اسلام سے دلچسپی اور ملت اسلامیہ کا درد رکھنے والوں کے غور و فکر کے لیے اہم یا مفید ہو سکتی ہیں۔

۲ ۔ پیش کیا جانے والا لوازمہ بالعموم بلا تبصرہ شائع کیا جاتا ہے۔ کسی مضمون، نقطۂ نظر، خیال یا معلومات کے انتخاب کی وجہ اس سے ہمارا اتفاق نہیں، اس کی اہمیت ہوتی ہے۔ کسی مضمون یا معلومات کی مدلل تردید یا اس سے اختلاف پر مبنی لوازمہ کو بھی جگہ دی جا سکتی ہے۔

۳ ۔ **معارف فیچر** کو بہتر بنانے کے لیے مفید معلومات کے حصول یا ان کے ذرائع تک رسائی میں آپ کی مدد کا خیر مقدم کیا جائے گا۔

۴ ۔ ہمارے فراہم کردہ لوازمے کے مزید، لیکن غیر تجارتی ابلاغ کی عام اجازت ہے۔

۵ ۔ **معارف فیچر** کی کوئی قیمت مقرر نہیں۔ تاہم عطیات کی ضرورت بھی رہتی ہے اور عطیات قبول بھی کیے جاتے ہیں۔ **اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی**

ترک مصر تعلقات: نئی صبح کا آغاز؟

Amr Imam

مصر اور ترکیہ کے درمیان کشیدگی ختم کرانے کے لیے ایک زمانے سے کوششیں کی جارہی تھیں۔ یہ کوششیں رنگ لائیں اور ترکیہ کے صدر نے فروری کے وسط میں مصر کا دورہ کیا۔ اس دورے میں انہوں نے مختلف شعبوں میں دوطرفہ تعاون بڑھانے اور علاقائی معاملات میں مل کر چلنے سے اتفاق کیا۔

مصر اور ترکیہ کے تعلقات میں حقیقی کشیدگی کی بنیاد ۲۰۱۳ء میں پڑی تھی، جب مصری فوج نے اخوان المسلمون سے تعلق رکھنے والے محمد مرسی کو صدر کے منصب سے ہٹا کر اقتدار پر دوبارہ قبضہ کرلیا تھا۔ تب اخوان المسلمون اور رجب طیب ایردوان کی پارٹی جسٹس اینڈ ڈیولپمنٹ پارٹی کے درمیان نظریاتی ہم آہنگی غیر معمولی تھی۔

مصری فوج کے ہاتھوں صدر محمد مرسی کی برطرفی ترکیہ کو اس لیے ایک آنکھ نہ بھائی کہ اُس نے کئی عشروں کے بعد فوجی اقتدار کی بساط لپیٹنے میں کامیابی حاصل کی تھی۔

تب سے اب تک بہت کچھ بدل چکا ہے۔ اب دونوں ممالک نے اختلافات کو ایک طرف ہٹا کر دوطرفہ تعلقات اور اشتراکِ عمل کا نیا باب رقم کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ ترکیہ کے عوام نے کئی منتخب حکومتوں کا تختہ الٹتے دیکھا تھا۔ مصر کے موجودہ صدر جنرل عبدالفتاح السیسی نے محمد مرسی کو برطرف کرنے سے ایک ماہ قبل استنبول کا دورہ کرکے اپنے ترک ہم منصب (وزیر دفاع) سے ملاقات کی تھی۔

تب ترکیہ میں مصر کے سفیر عبدالرحمٰن صلاح الدین نے اپنی کتاب ''آئی واز این ایمبیسیڈر ٹو دی سلطانز کنٹری'' میں لکھا ہے کہ جب جنرل عبدالفتاح السیسی نے استنبول میں قدم رکھا تو ہوٹل تک کار میں سفر کے دوران وہ مسلسل کھڑکی سے باہر دیکھتے رہے۔ وہ شہر کی صفائی اور چمک دمک دیکھ کر حیران تھے۔

جنرل عبدالفتاح السیسی جب ترکیہ کے صدر رجب طیب ایردوان سے ملے تو ان کی سحر انگیز شخصیت اور عرب ممالک سمیت پوری اسلامی دنیا میں ان کی غیر معمولی مقبولیت کو سراہا۔ ساتھ ہی ساتھ انہوں نے یہ امید بھی ظاہر کی کہ وہ اپنی پُراثر شخصیت کے ذریعے یورپ سے تعلقات بہتر بنانے میں مصر کی مدد کریں گے۔

دوسری طرف صدر ایردوان نے ۲۰۱۱ء میں اس وقت کے آمر حسنی مبارک کے خلاف احتجاجی تحریک میں اپوزیشن کے مظاہرین کا ساتھ دینے اور انتخابات کی راہ ہموار کرنے پر مصری فوج کو سراہا۔ ان انتخابات کے نتیجے میں محمد مرسی صدر منتخب ہوئے۔

سیاسی اور نظریاتی بنیاد پر شروع ہونے والا تناؤ اس قدر بڑھا کہ جون ۲۰۲۰ء میں جب صدر ایردوان نے ترک حمایت یافتہ فوجی مشرقی لیبیا بھیجے تو ترکیہ اور مصر کے درمیان فوجی مناقشے کی راہ ہموار ہوتی دکھائی دی۔ صدر ایردوان نے وہ سرخ لکیر عبور کرلی تھی جو عبدالفتاح السیسی نے کھینچی تھی۔

رجب طیب ایردوان کے بھیجے ہوئے فوجی لیبیا کی سرحد سے محض چند کلومیٹر کے فاصلے پر تعینات تھے۔ یہ فوجی لیبین نیشنل آرمی کی مدد کے لیے آئے تھے جو مشرقی لیبیا پر متصرف تھی۔ یہ علاقہ مصر سے جُڑا ہوا تھا۔

انقرہ نے مصر کی قیادت کو اس وقت بھی ناراض کیا، جب اس نے بحیرۂ احمر میں سوڈان کے ساحل پر مصر کی نہرِ سوئز سے چند کلومیٹر دور سواکن نامی جزیرے کو ریلیز کیا۔

ترکیہ اور مصر کے صدور گزشتہ سال تین بار ملے ہیں۔ ان میں قطر میں فٹبال ورلڈ کپ بھی شامل ہے۔ دونوں رہنما گزشتہ ستمبر میں بھارت کے دارالحکومت نئی دہلی میں جی۔۲۰ سربراہ کانفرنس کے موقع پر بھی ملے تھے۔ اس کے بعد نومبر میں سعودی دارالحکومت ریاض میں عرب اور اسلامی ممالک کے سربراہ اجلاس کے موقع پر بھی ان کی ملاقات ہوئی تھی۔

۷/اکتوبر ۲۰۲۳ء کو اسرائیل پر حماس کے حملوں کے بعد حماس کے خلاف کارروائیوں کے نام پر اسرائیلی فورسز نے غزہ کے لوگوں کو جو جانی و مالی نقصان پہنچایا ہے اس نے بھی ترکیہ اور مصر کو ایک کر دیا ہے۔ غزہ کے لوگوں کو امدادی سامان کی ترسیل

اندرونی صفحات پر

- یوکرین: کیا یورپ حکمتِ عملی بدل رہا ہے؟
- کیا بنگلا دیش ماڈل یہاں چل سکتا ہے؟
- مالدیپ بنام لکشدیپ: بھارت کا ایک نیا شوشہ
- رام مندر کی تعمیر: لمحۂ فکریہ؟
- 'اسرائیل نے کبھی دو ریاستی حل کو کامیاب ہونے نہیں دیا'
- سال ۲۰۲۴ء دنیا بھر میں انتخابات کا سال
- ٹنل فارمنگ کا اُمید افزا راستہ
- چین بھارت رسہ کشی اور خطے کے ممالک
- بلوچستان میں اتنا تشدد کیوں ہے؟
- پرنٹ میڈیا کو اپنا مزاج بدلنا ہوگا!

Fortnightly "Maarif Feature" Karachi: REG.No.SC-1303

اور جنگ ختم ہونے پر تعمیرِ نو میں ترکیہ کا کلیدی کردار ہے۔

مشرقی بحیرہ احمر میں تیل کے نئے ذخائر کی دریافت کے بعد متعدد ممالک کے درمیان سمندری حدود کا تنازع اٹھ کھڑا ہوا۔ ترکیہ اور مصر کے درمیان بھی اس حوالے سے تنازع سامنے آیا۔

ترکیہ نے ۲۰۱۹ء میں لیبیا کے ساتھ سمندری حدود کے تعین کا ایک معاہدہ کیا تو جواب میں مصر نے بھی ۲۰۲۰ء میں یونان کے ساتھ ایسا ہی معاہدہ کیا۔ یہ سب کچھ ترکیہ کے لیے انتہائی پریشان کن تھا۔ ترک قیادت نے چاہا کہ مصر کو یونان اور قبرص سے ۲۰۰۳ء کے معاہدوں سے کہیں زیادہ سمندری علاقہ دے کر تنازع ختم کرے اور تعلقات کی بحالی کا عمل شروع کرے۔ ''المجلہ'' سے گفتگو کرتے ہوئے مصر کے سابق معاون وزیر خارجہ محمد الشاذی نے کہا کہ سمندری حدود کے حوالے سے مصر اور ترکیہ کے درمیان کوئی سمجھوتا پورے خطے کے لیے انتہائی بارآور ثابت ہوگا۔

مصر کے لیے یہ بہت نازک لمحہ ہے۔ ایک طرف تو وہ ترکیہ سے تعلقات بہتر بنانے کا خواہاں ہے اور چاہتا ہے کہ اشتراکِ عمل کا دائرہ وسیع کرکے ترقی واستحکام کی راہ ہموار کی جائے اور دوسری طرف اسے یونان اور قبرص کو ناراض کرنے سے بھی بچنا ہے کیونکہ ان دونوں کے بھی ترکیہ سے سمندری حدود کے حوالے سے اختلافات ہیں۔

ایسے میں یہ بات بھولنی نہیں چاہیے کہ یونان کے وزیر خارجہ جارج گیرپیٹرائٹس نے جنوری کے وسط میں قاہرہ کا دورہ کر کے مصری صدر عبدالفتاح السیسی اور مصری ہم منصب سمح شوکری سے گفت وشنید کی تھی۔ اس گفت وشنید میں یونان کے وزیر خارجہ نے ترکیہ سے سمندری سرحدوں کے تعین کے تنازع پر ضرور تبادلہ خیال کیا ہوگا۔

تیل برآمد کرنے والے ممالک کی تنظیم اوپیک کی طرز پر ایسٹ میڈیٹیرینین گیس فورم میں ترکیہ، یونان اور قبرص کے درمیان وسیع تر تعاون اور اشتراکِ عمل کی گنجائش موجود ہے۔ اس حوالے سے تینوں ممالک اپنی اپنی کوششوں میں مصروف بھی ہیں تاکہ علاقائی سطح پر کشیدگی کی سطح نیچے لائی جاسکے۔

یہ فورم مصر نے ۲۰۱۹ء کے اوائل میں قائم کیا تھا اور بحیرۂ روم کے تمام ممالک کو اس میں شمولیت اختیار کرنے کی دعوت دی تھی۔ گویا ترکیہ کو بھی شمولیت کی دعوت دی گئی جبکہ اس وقت ترکیہ اور مصر کے تعلقات خاصے کشیدہ تھے اور معاملات کو درست کرنے کی کوئی حقیقی راہ بھی ہموار ہوتی دکھائی نہ دیتی تھی۔

لیبیا میں ترکیہ کی حمایت سے لڑنے والے فوجیوں اور اخوان المسلمون سے نظریاتی ہم آہنگی جاری رہے گی؟ مصر کو بہت سے معاملات پر اختلاف ہے۔ اخوان المسلمون سے ترکیہ کے تعلقات اور نظریاتی ہم آہنگی بھی ایک ایسا ہی ایشو ہے۔ مصر اس حوالے سے تحفظات کا اظہار کرتا رہا ہے۔ مصر کے تحفظات دور کرنے پر ترکیہ نے تھوڑی بہت توجہ دی ہے۔ چند ماہ کے دوران اس نے اخوان المسلمون سے وابستہ چند میڈیا آؤٹ لیٹس بند کیے ہیں اور اخوان کے چند سینئر ارکان کو ترک سرزمین چھوڑنے کو کہا ہے۔

اگر ترکیہ اور مصر کی حکومتیں لیبیا میں اشتراکِ عمل کی راہ ہموار کریں تو وہاں حقیقی منتخب اور نمائندہ حکومت کے قیام میں مدد ملے گی، ملک مستحکم ہوگا اور ترکیہ و مصر کے تعلقات میں بھی غیر معمولی بہتری کی راہ ہموار ہوگی۔ لیبیا کو اس وقت اندرونی سلامتی اور معاشی استحکام کی غیر معمولی حد تک ضرورت ہے۔ ترکیہ اور مصر کے بہتر تعلقات اس سلسلے میں کلیدی کردار ادا کرسکتے ہیں۔

صدر اردوان کے مصر کے دورے سے قبل ترکیہ نے مصر کو ریموٹ کنٹرولڈ ڈرونز کی فراہمی کے ایک معاہدے کو حتمی شکل دی، جو دوستی اور خیرسگالی کا معقول اظہار تھا۔ مصر نے گزشتہ برس دسمبر میں دفاعی ساز وسامان کی اپنی اہم نمائش EDEX میں ان ڈرونز کی نمائش کی۔

تعلقات بہتر ہونے کی صورت میں مصر کو ترکیہ سے جدید ترین ملٹری ٹیکنالوجی بھی حاصل ہوسکتی ہیں۔ مصر اپنی دفاعی صلاحیت میں غیر معمولی اضافے کے لیے کوشاں ہے۔ غزہ کی لڑائی نے اُسے بھی تشویش میں مبتلا کیا ہے۔ کسی ناگہانی صورتِ حال میں اُسے اسرائیل کا بھی سامنا ہوسکتا ہے۔

تعلقات میں بہتری آنے کی صورت میں دونوں ممالک معاشی ترقی پر زیادہ توجہ دے سکیں گے۔ دونوں کے لیے برآمدات میں اضافہ کرنا بہت حد تک ممکن ہوجائے گا۔ مصر کو معاشی اصلاحات کی ضرورت ہے۔ ایسا اُسی وقت ہوسکتا ہے جب ترکیہ سے تعلقات بہتر ہوں اور کسی دوسرے ملک کی طرف سے بھی کسی خاص الجھن کا سامنا نہ ہو۔

بہت سے معاملات میں شدید اختلافات اور سفارتی تعلقات میں نمایاں کشیدگی کے باوجود ترکیہ اور مصر کے معاشی و تجارتی تعلقات زیادہ متاثر نہیں ہوئے۔ ۲۰۲۳ء میں دونوں ملکوں کے درمیان تجارت ۲۰۲۲ء کے ۶/ارب ۷۰ کروڑ ڈالر کے مقابلے میں ۷/ارب ۷۰ کروڑ ڈالر تک پہنچ گئی۔ قاہرہ میں سفارتی اور تجارتی امور کے ماہرین کہتے ہیں کہ تجارتی تعلقات کا بلند گراف دونوں ملکوں کے درمیان سیاسی وسفارتی سطح کی کشیدگی کا گراف نیچے لانے میں کلیدی کردار ادا کرسکتا ہے۔

معروف تھنک ٹینک اِجپشین فورم فار اکنامک اینڈ اسٹریٹجک اسٹڈیز کے سربراہ رشد عبدو نے ''المجلہ'' کو بتایا کہ دونوں ممالک مشترکہ سرمایہ کاری کے منصوبوں سمیت دوطرفہ معاشی تعلقات کو مزید وسعت دینے کے لیے کام کرتے رہیں گے۔ ان کا کہنا ہے کہ معاشی تعلقات کا وسیع ہوتا ہوا دائرہ سیاسی اختلافات کا گراف نیچے لانے میں کامیاب ہو ہی جائے گا۔

(ترجمہ: ابوصباحت)

"Erdogan in Cairo: A new dawn for Egypt-Turkey ties?" ("en.majalla.com". February 14, 2024)

اسلامک ریسرچ اکیڈمی کی شائع کردہ نئی کتب

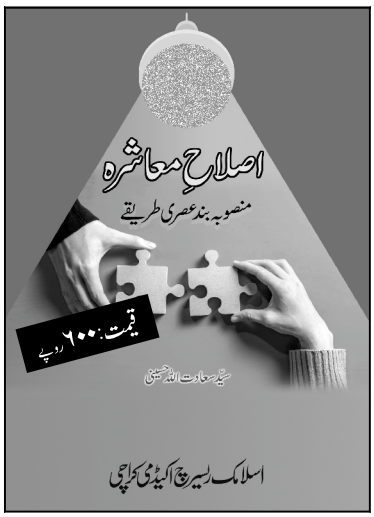

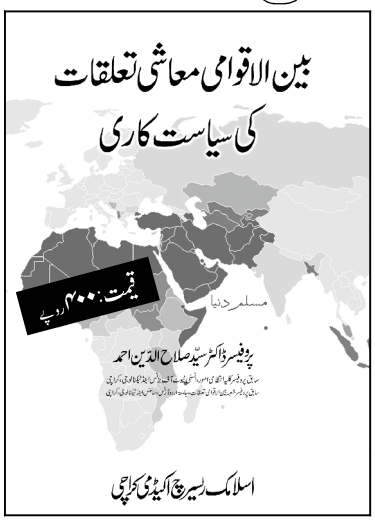

اکیڈمی بک سینٹر۔ D-35، بلاک۔5، فیڈرل بی ایریا، کراچی۔ فون: 021-36809201

یوکرین: کیا یورپ حکمتِ عملی بدل رہا ہے؟

Frank Hofmann

روس اپنے ہم خیال ممالک کے ساتھ مل کر جو کچھ سوچ اور کر رہا ہے اُس سے یورپ میں بہت حد تک تشویش پائی جاتی ہے۔ معاہدۂ شمالی بحرِ اوقیانوس کی تنظیم نیٹو کے جرنیل مل بیٹھے ہیں اور روس سے نپٹنے کی حکمتِ عملی ترتیب دینے میں مصروف ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ روس سے ٹکراؤ کی صورت میں یورپ کے لیے خطرات بڑھ جائیں گے۔ اگر روس نے بیلارس اور دیگر ہم خیال ممالک کے ساتھ مل کر یورپ کو نشانہ بنانے کی ٹھان لی تو ایک اور جنگِ عظیم چھڑ سکتی ہے۔ بہر کیف، یورپ اس وقت روس سے بے نیاز رہنے کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ روس سے بچاؤ ممکن بنانے کے لیے یورپ جو بھی حکمتِ عملی اختیار کرے گا اور جو بھی تیاریاں کرے گا اُن کا حتمی فائدہ یوکرین ہی کو پہنچے گا کیونکہ سرِ دست اُسے روس کے مقابل اسلحہ بھی چاہیے اور سفارتی و اخلاقی حمایت بھی۔

نیٹو کے کئی اعلیٰ جرنیل خبردار کر چکے ہیں کہ روس سے کسی بڑی جنگ کے لیے تیار رہنے ہی میں دانش مندی ہے۔ جنوری کے آخر میں دو روزہ اجلاس کے بعد پریس بریفنگ میں نیٹو ملٹری کمیٹی کے ولندیزی چیئرمین ایڈمرل باب بوئر نے کہا تھا کہ ہمیں یہ محسوس کرنا ہوگا کہ جنگ نہ کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم حالتِ امن میں ہیں۔

اُنہی دنوں ناروے کے اخبار Dagbladet نے بتایا کہ نارویجین مسلح افواج کے سربراہ جنرل آئرک کرسٹوفرسن کا کہنا ہے کہ یورپ کے پاس غیر معمولی دفاعی صلاحیت یقینی بنانے کے لیے اب دو سے تین سال ہی بچے ہیں۔ اِس کے فوراً بعد پڑوسی ملک سویڈن کی مسلح افواج کے سربراہ مائیکل بیڈن نے ہم وطنوں سے بالعموم اور سیاست دانوں سے بالخصوص کہا کہ اب مرحلہ محض سمجھنے کا نہیں بلکہ کچھ کرنے کا ہے۔

یورپ بھر میں عسکری قیادت سیاست دانوں پر زور دے رہی ہے کہ روس کے بارے میں تصوّر اور حکمتِ عملی دونوں کو تبدیل کریں۔ جرمن نشریاتی ادارے ڈوئچے ویلے سے انٹرویو میں سلامتی سے متعلق امور کے ماہر نکو لینچ نے کہا کہ یورپ نے یوکرین کو اسلحہ فراہم کرنے اور روس پر پابندیاں لگانے پر اکتفا کیا تھا۔ یہ حکمتِ عملی کارگر ثابت نہیں ہوئی ہے۔ اب اِس سے زیادہ اور ہٹ کر کچھ کرنا ہوگا۔

یورپ کے فوجی حکام کو زیادہ تشویش اس بات سے ہے کہ ایک طرف یوکرین کے پاس اسلحہ اور گولا بارود کم پڑ رہا ہے اور دوسری طرف یورپ میں فوجی ساز و سامان تیار کرنے کی صلاحیت کمزور پڑتی جارہی ہے۔ نیٹو اگر یہ چاہتی ہے کہ روس کو کسی طور روکا جائے تو محض ردِ جارحیت (ڈیٹرنس) کافی نہیں بلکہ یوکرین کو مضبوط کرنا بھی لازم ہے۔ گزشتہ برس یورپی یونین نے یوکرین سے وعدہ کیا تھا کہ مارچ ۲۰۲۴ تک توپوں کے ۱۰ لاکھ گولے فراہم کردیے جائیں گے۔ اب کہا جارہا ہے کہ ڈیڈ لائن تک اِس کا نصف ہی فراہم کیے جاسکیں گے۔

یوکرین اور روس کے امور کے ماہر اور میونخ سیکورٹی کانفرنس سے وابستہ نکو لینچ کہتے ہیں کہ اس کا ایک بنیادی سبب یہ ہے کہ جرمن حکومت نے اسلحہ ساز اداروں کو انڈر رائٹنگ گارنٹی جاری کرنے میں دیر کردی۔ نکو لینچ کہتے ہیں کہ جرمن اسلحہ ساز ادارے دو سال کی تاخیر سے پیداوار بڑھا رہے ہیں۔ سوال صرف یوکرین کا نہیں ہے۔ یورپ میں اور بھی بہت سے ملک ہیں جن کے اسلحہ ڈپو بہت حد تک خالی پڑے ہیں۔

ڈرونز، گولا بارود اور کامبیٹ وہیکلز میں سرمایہ کاری لازم ہوچکی ہے۔ جرمن کاؤنسل آن فارن ریلیشنز میں سینٹر فار سیکورٹی اینڈ ڈیفنس کے سربراہ کرسچین مولنگ کہتے ہیں کہ نیٹو اگر اپنے آپ کو روس کے خلاف کسی جنگ میں ثابت قدم رکھنا چاہتی ہے تو ایسا کرنے کے قابل ہونے کے لیے اس کے پاس صرف پانچ سال ہیں، جس اُسے بہت سی تیاریاں کرنی ہیں۔ کرسچین مولنگ کی رپورٹ بہت حد تک چشم کُشا ہے اور روس کے خلاف لڑائی کے حوالے سے خطرے کی گھنٹی قرار دی جارہی ہے۔

برلن میں قائم تھنک ٹینک یوروپین کاؤنسل آن فارن ریلیشنز کے گساو گریسل نے ایک تجزیے میں لکھا ہے کہ امریکا اور یورپ کو مل کر اپنے مالیاتی نظام کا جائزہ لینا ہوگا کیونکہ روس اور اس کے ہم خیال ممالک کے ممکنہ حملوں سے دفاع کے لیے ناگزیر ہے کہ ڈرون، گولا بارود اور کامبیٹ وہیکلز کی پیداوار بڑھائی جائے۔ ان کا کہنا ہے کہ مشرقی یورپ کے اسلحہ خانوں سے روسی ساخت کا اسلحہ یوکرین کو اس حد تک فراہم کیا جاچکا ہے کہ اب دینے کو کچھ خاص بچا نہیں۔ اُنہوں نے پُرزور یہ بات کہی ہے کہ یوکرین کے علاوہ نیٹو کے ارکان کے لیے غیر معمولی پیمانے پر اسلحہ تیار کرنا لازم ہوچکا ہے۔

یورپ میں انفرادی حیثیت میں اسلحہ تیار کرنے والے ادارے پیداوار بڑھا رہے ہیں۔ فروری کے وسط میں جرمن چانسلر اولاف شولز نے جرمن اسلحہ ساز ادارے رائنمیٹل کے ایک بڑے پلانٹ کا سنگِ بنیاد رکھا۔ جرمن صوبے لوئر سیگزنی میں تقریب سے خطاب کرتے ہوئے جرمن چانسلر نے کہا کہ ہمیں بہت بڑے پیمانے پر اسلحہ سازی کی طرف جانا ہے۔

رائنمیٹل کی سائٹ پر ڈنمارک کے وزیرِ اعظم میٹ فریڈرکسن نے جرمن چانسلر اولاف شولز اور جرمن وزیرِ دفاع بورس پسٹوریس سے ملاقات کی۔ یورپ کے دیگر قائدین کی طرح میٹ فریڈرکسن اور اولاف شولز کئی بار کہہ چکے ہیں کہ یورپ کو اسلحے کی پیداوار بڑھانے کے لیے انقلابی نوعیت کے اقدامات کرنا ہوں گے۔ لندن سے شائع ہونے والے اخبار ''فائنانشل ٹائمز'' میں شائع ہونے والے ایک کُھلے خط میں دونوں قائدین نے کہا کہ یوکرین اسلحے کی پیداوار کے حوالے سے بہت پیچھے رہ گیا ہے، ایسے میں یورپی حکومتوں کو اسلحہ بنانے کے ساتھ ساتھ اسلحہ خریدنے پر بھی توجہ مرکوز کرنی چاہیے۔ ایسا لگتا ہے کہ روس اپنی کمی شمالی کوریا کی مدد سے پوری کرلیتا ہے جبکہ گولا بارود کے استعمال کے معاملے میں یوکرین کو راشننگ کرنا پڑ رہی ہے۔

امریکن سینٹر فار نیول اینالسز کے مائیکل کافمین نے حال ہی میں ''وار آن دی راکز'' سیریز کے تحت ایک پوڈ کاسٹ میں کہا کہ روس کے پاس گولا بارود اس قدر ہے کہ یوکرین کے ایک گولے کے جواب میں وہ پانچ میزائل داغتا ہے، جس کے نتیجے میں جانی و مالی نقصان بہت زیادہ ہوتا ہے۔ بعض ماہرین کا خیال ہے کہ روس اور یوکرین کے درمیان تناسب ایک اور دس کا ہے۔ کافمین کا خیال ہے کہ یوکرین کو سرحدی قصبے ایوڈیوکا سے پیچھے ہٹنا پڑے گا۔ مزید شمال میں کُپیانسک شہر پر روسی حملے کا خطرہ بھی بڑھ گیا ہے۔

کرسچین مولنگ کہتے ہیں کہ یوکرین پر روس کی لشکر کشی کو دو سال ہوچکے ہیں۔ اس دوران یوکرین کو یورپ اور امریکا کی طرف سے اس قدر کم اسلحہ ملا ہے کہ یوکرین کی افواج کو اپنے آزاد کرائے ہوئے شہروں سے بھی پیچھے ہٹنا پڑا ہے۔

نیوز پیپر گروپ Redaktionsnetzwerk Deutschland سے انٹرویو میں جرمن میجر جنرل کرسچین فرائیڈنگ نے کہا ہے کہ ہماری بنیادی حکمتِ عملی اب یہ ہونی چاہیے کہ یوکرین کی فوج اس قابل ہوجائے کہ اپنا دفاع خود کرسکے۔ اس حوالے سے فکر و عمل کا آغاز ہوچکا ہے۔

یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ کمتر وسائل کے باوجود

باقی صفحہ نمبر ۱۶

کیا بنگلادیش ماڈل یہاں چل سکتا ہے؟

اروند سہارن نوجوان صحافی ہیں۔ تعلق بھارت سے ہے۔ نیوزی لینڈ میں رہتے ہیں۔ اُردو لکھ پڑھ لیتے ہیں۔ یوٹیوب پر ان کا ایک مستقل فیچر ''سرحد کے اُس پار'' کے عنوان سے ہے۔ اس میں وہ مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے پاکستانیوں سے انٹرویو کرتے ہیں۔ تقریباً دو سال پہلے انہوں نے میرا بھی انٹرویو لیا جو دو نشستوں میں مکمل ہوا۔ اچھی بات یہ تھی کہ میرے جوابات کو انہوں نے ایڈٹ نہیں کیا اور بلا کم و کاست نشر کیا۔ بھارتی ناظرین اور سامعین نے مجھے جی بھر کر بُرا بھلا کہا۔ یہاں تک کہ اروند سہارن کو کہنا پڑا کہ ان کے مہمان کے ساتھ ایسا نہ کیا جائے۔ اصل بات جو بتانی ہے، یہ ہے کہ انہوں نے بنگلا دیش کی ترقی اور بہتر اقتصادی اشاریوں کا ذکر کرتے ہوئے پوچھا کہ آخر بنگلا دیش پاکستان سے آگے کیوں نکل گیا؟ اس کا فوری جواب میں نے یہ دیا کہ بنگلا دیش کی خوش بختی ہے کہ اس کے پڑوس میں کوئی افغانستان آباد نہیں ہے!

یہ بات اس لیے یاد آئی کہ آج کل بنگلا دیش ماڈل کا، پاکستان کے حوالے سے، بہت چرچا ہے! تاریخ بھی کیسے کیسے مذاق کرتی ہے۔ جنوبی کوریا کے بارے میں روایت ہے کہ پاکستان کے پانچ سالہ ترقیاتی منصوبوں کو اس نے اپنایا اور سرخرو ٹھہرا! (معلوم نہیں یہ بات کہاں تک درست ہے) آج ہم بنگلا دیش ماڈل کی پیروی کرنے کا سوچ رہے ہیں!

کسی بھی ملک میں کامیاب ہونے والے ماڈل کو کسی دوسرے ملک پر منطبق کرنا اوّل تو ناممکن ہے، مگر فرض کیجیے اگر منطبق ہو بھی گیا تو اس کی کامیابی معجزے سے کم نہیں اور معجزات کا زمانہ لَد چکا! دنیا میں دو گھر بھی ایک جیسے نہیں ہو سکتے، دو ملک کیسے ایک جیسے ہو سکتے ہیں؟ بنگلا دیش اپنی جی ڈی پی کا کتنے فیصد دفاع پر خرچ کرتا ہے اور پاکستان کتنے فیصد؟ بنگلا دیش کو ایسے بہت سے فوائد حاصل ہیں جن سے پاکستان محروم ہے! دفاع کا بجٹ ایک بہت بڑا عامل ہے۔ افغانستان، ٹی ٹی پی، مشرقی سرحد، لائن آف کنٹرول، یہ سب وہ زخم ہیں جو پاکستان کے جسم پر موجود ہیں اور جن سے وقتاً فوقتاً لہو رِستا رہتا ہے! بنگلا دیش کا بجٹ اس قسم کی مجبوریوں سے آزاد ہے۔ بنگلا دیش کے تین طرف بھارت ہے۔ بھارت سے بنگلا دیش کو کوئی عسکری خطرہ نہیں! اسی لیے اس کا خرچ دفاع پر پاکستان کی نسبت بہت کم ہے! حکومت سازی میں جو کردار اسٹیبلشمنٹ کا پاکستان میں ہے اور رہا ہے، بنگلا دیش میں نہیں ہے! صرف ایک فرق ہی دیکھ لیجیے۔ بنگلا دیش کی وزارتِ دفاع کا سیکرٹری ایک سول سرونٹ ہے جبکہ ہمارے ہاں بہت عرصہ سے ایسا نہیں ہے!

بنگلا دیش ماڈل کے حوالے سے جو بات بہت زیادہ کی جا رہی ہے، وہ حکومت کا تسلسل ہے۔ حسینہ واجد پندرہ سال سے وزیراعظم چلی آ رہی ہیں! پاکستان میں کوئی وزیراعظم پانچ سال بھی مکمل نہیں کر سکا! اس سے بھی زیادہ بدقسمتی یہ ہے کہ ہر نئی حکومت، گزشتہ حکومت کے منصوبوں کے ساتھ سوتیلی ماں جیسا سلوک کرتی ہے! پالیسیوں کے تسلسل کا پاکستان میں سوچا بھی نہیں جا سکتا! ہر حکومت الف سے شروع کرتی ہے۔ ابھی مشکل سے سین شین تک پہنچ پاتی ہے کہ ختم ہو جاتی ہے۔ آنے والی حکومت پھر الف سے شروع کرتی ہے! ایک عرصہ سے ملک اسی دائرے کے اندر چکر کاٹ رہا ہے! یہاں ایک دلچسپ موازنہ کرنا شاید نامناسب نہ ہو! معاشی مسائل اور معاشی منصوبوں کے متعلق جو اجلاس ہوتے ہیں، حسینہ واجد ان اجلاسوں کی صدارت خود کرتی ہیں۔ یہ اجلاس دس دس گھنٹے مسلسل جاری رہتے ہیں اور وہ بیٹھی رہتی ہیں۔ ہمارے ہاں صورتحال قابلِ رحم ہے اور مضحکہ خیز بھی! جسے Span of attention کہتے ہیں یعنی توجہ کی مدت پندرہ، بیس منٹ یا آدھے گھنٹے سے زیادہ نہیں! نہ فائل خود پڑھتے ہیں! اس سلسلے میں کئی حقائق تو لطیفوں کی صورت اختیار کر چکے ہیں! آج اگر بنگلا دیش کی برآمدات حیران کن حد تک زیادہ ہیں اور دیگر اقتصادی اشاریے مثبت ہیں تو اس کی پشت پر وزیراعظم اور ان کی ٹیم کی شبانہ روز محنت کا کردار ہے!

افغانستان کا ذکر اوپر عسکری حوالے سے کیا گیا ہے! معاشی نقطۂ نظر سے ہمارا یہ پڑوسی ہماری معیشت پر مستقل بوجھ ہے۔ یہ آج کی بات نہیں، موجودہ پاکستان کے علاقے صدیوں سے افغانوں کی جولان گاہ رہے ہیں۔ موجودہ افغانستان ۱۷۴۷ء میں ریاست کے طور پر وجود میں آیا مگر اس سے پہلے بھی یہ لوگ حملہ آور ہوتے تھے اور اناج، مویشی، سونا چاندی لوٹ کر لے جاتے تھے۔ احمد شاہ ابدالی آٹھ بار حملہ آور ہوا اور ہر بار لوٹ مار کر کے گیا۔ اُس زمانے کی ایک پنجابی بولی آج تک تاریخ میں محفوظ ہے۔ کھادا پیتا لاہے دا، تے باقی احمد شاہے دا! حملوں کا زمانہ ختم ہوا تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ افغانستان خود کفیل ہو گیا۔ حملہ آوروں کی لوٹ مار کی جگہ اسمگلنگ نے لے لی جو لوٹ مار کا دوسرا نام ہے! گندم، چینی، ادویہ، سیمنٹ، سریا، کون سی شے ہے جو اسمگل ہو کر نہیں جاتی۔ بنگلا دیش اور پاکستان میں ایک بہت بڑا فرق یہ ہے کہ بنگلا دیش صرف اپنے ملک کے لیے کماتا، اُگاتا اور بناتا ہے جبکہ پاکستان نے اپنے علاوہ افغانستان کے لیے بھی کمانا، اُگانا اور بنانا ہے! ڈالر کی مہنگائی میں، ہم سب جانتے ہیں کہ افغانستان کا بہت بڑا کردار ہے! بدقسمتی سے ہماری حکومتوں کی ہمدردیاں اپنے لوگوں کی نسبت افغانستان کے ساتھ زیادہ رہیں! پاکستان کئی دہائیوں سے چالیس لاکھ افغان مہاجرین کو برداشت کر رہا ہے۔ اس کے مقابلے میں صرف نو لاکھ ساٹھ ہزار روہنگیا مہاجر بنگلا دیش میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے تو بنگلا دیش کا رویہ سردمہری کا، بلکہ معاندانہ رہا ہے۔ اس کی پوری کوشش ہے کہ یہ مہاجر جلد سے جلد واپس چلے جائیں۔ انہیں مزدوری یا نوکری کرنے کی اجازت نہیں۔ یہ کیمپوں میں مقید ہیں! بنگلا دیش ماڈل کی بات کرنے سے پہلے یہ بھی دیکھنا اور سوچنا چاہیے کہ بنگلا دیش لسانی اور نسلی حوالے سے ایک اکائی ہے اور مضبوط، ایک دوسرے سے جُڑی ہوئی اور باہم پیوست اکائی ہے۔ حکومت کے تسلسل میں یہ عامل بہت اہم ہے۔ اس کے مقابلے میں پاکستان کئی لسانی اور نسلی ٹکڑوں میں بٹا ہوا ہے۔ کسی بھی حکومت کے نیچے سے زمین کھینچنا یہاں بہت آسان ہے۔ پاکستان جاگیرداروں، وڈیروں، سرداروں اور خوانین و ملوک کا ملک ہے۔ بنگلا دیش ان بلاؤں سے پاک اور محفوظ ہے! مشرقی پاکستان کے الگ ہونے میں اس سرداری نظام اور وڈیرہ شاہی کا بھی کردار تھا۔ مزاج الگ الگ تھے۔ ذہنی سانچہ مختلف تھا۔ سیاسی رویّوں میں فرق تھا، یہ فرق آج بھی موجود ہے۔ اگر ترقی کرنے کی نیت ہو اور لیڈر شپ مخلص ہو تو کسی دوسرے ملک کا ماڈل اپنانے کے بجائے اپنا ماڈل خود بنانا ہوتا ہے۔ ہر ملک کے حالات مختلف ہیں۔

ملائیشیا کے مہاتیر اور سنگاپور کے لی کوان یو نے اپنے اپنے ملک کے ماڈل خود تیار کیے۔ تھائی لینڈ اور تائیوان نے اپنی اپنی پالیسیاں خود وضع کیں! ہانگ کانگ کا اپنا طریق کار تھا! پاکستان اگر ترقی کرنے میں سنجیدہ ہے تو اسے اپنے مخصوص اندرونی اور خارجی مسائل کو سامنے رکھ کر ایسی طویل المیعاد پالیسیاں وضع کرنا ہوں گی جو صرف اسی کے لیے ہوں گی! کسی دوسرے ملک کا ماڈل ہماری دستگیری نہیں کر سکتا!

(بحوالہ: روزنامہ ''دنیا'' کراچی۔ ۱۲ر فروری ۲۰۲۴ء)

مالدیپ بنام لکشدیپ: بھارت کا ایک نیا شوشہ

افتخار گیلانی

بھوٹان اور مالدیپ سمیت جنوبی ایشیا کے کسی بھی ملک کے تعلقات اس خطے کے سب سے بڑے ملک بھارت کے ساتھ اطمینان بخش نہیں رہے ہیں۔ یہ ایک ستم ظریفی ہے کہ دنیا کے ایک بڑے جمہوری ملک کے بجائے یہ ممالک اکثر چین کے ساتھ تعلقات کے حوالے سے گرم جوش رہتے ہیں۔ یہ ایک ایسا نکتہ ہے، جس کے لیے بھارتی سفارت کاروں کی نیند حرام ہونی چاہیے تھی۔ اب کچھ عرصے سے بھوٹان اور مالدیپ بھی بھارت کو آنکھیں دکھانے لگے ہیں۔ حلف برداری کے ایک دن بعد ہی مالدیپ کے نئے صدر محمد معیزہ نے بھارت کو باضابطہ طور پر ملک سے فوجیں ہٹانے کی درخواست کی تھی۔ چین کے سرکاری دورے سے واپسی پر مالدیپ کے صدر نے واضح طور پر کہا کہ مالدیپ کسی خاص ملک کے پچھواڑے میں نہیں ہے اور کسی ایک ملک پر انحصار کم کرنے کی کوششوں پر زور دیا۔ بھارت میں اس بات پر بھی خاصا تذبذب اور ناراضی ہے کہ مالدیپ کے نئے صدر نے اپنے غیر ملکی دوروں کا آغاز ترکیہ سے کیا۔ ورنہ ابھی تک سبھی سربراہان مملکت حلف برداری کے بعد بھارت کا رخ کرتے تھے۔ ترکیہ کے بعد وہ چین چلے گئے۔ اسی کے ساتھ مالدیپ کے تین نائب وزراء نے بھارتی وزیر اعظم نریندر مودی سے متعلق تضحیک آمیز الفاظ سوشل میڈیا پر استعمال کیے۔

قصہ یہ ہے کہ نئے سال کے اختتام پر مودی بحیرہ عرب کے خلیج عدن میں واقع جزائر لکشدیپ آئے تھے اور وہاں انہوں نے سمندر میں اسکوبا ڈائیونگ کرکے اس کے فوٹو اور ویڈیو سوشل میڈیا پر ریلیز کرکے سیاحوں کو لکشدیپ کی طرف آنے کی دعوت دی۔ ان کے حامیوں نے کہا کہ اب سیاحوں کو مالدیپ کے بجائے لکشدیپ آنا چاہیے۔ اس کے جواب میں مالدیپ کے کئی اراکین، اور اراکین پارلیمان نے وزیر اعظم مودی اور بھارتیوں کے رویے پر تنقید کی۔ مالدیپ سری لنکا اور بھارت کے جنوب مغرب میں بحر ہند میں واقع ہے جبکہ لکشدیپ کوچی سے چار سو کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ مالدیپ اور لکشدیپ کے درمیان سات سو کلومیٹر سے زیادہ کا فاصلہ ہے۔ سوشل میڈیا پر کی گئی پوسٹس سے معلوم ہوتا تھا، جیسے یہ جزائر ایک دوسرے کے قریب ہیں اور لکشدیپ کے ذریعے اب مالدیپ کو مسابقت کا سامنا کرکے سبق سکھایا جائے گا۔ ان دونوں جزائر کی ایک ہی مشترکہ بات ہے، کہ دونوں مسلم اکثریتی جزائر ہیں۔ ورنہ یہ ایک دوسرے سے کوسوں دور ہیں، اور دونوں کے ساحل بھی مختلف ہیں۔ مالدیپ خط استوا کے بالکل قریب ہے اس لیے پورا سال ایک ہی درجہ حرارت اور دھوپ ہوتی ہے۔

بھارت میں جب سے ہندو قوم پرست حکومت برسرِ اقتدار آئی ہے، تب سے لکشدیپ کے باسی بھی مضطرب ہیں۔ کشمیریوں کی طرح اُن کا بھی قصور بس اتنا ہے کہ وہ مسلمان ہیں اور بھارت کے موجودہ حکمرانوں کی آنکھوں میں کھٹکتے ہیں۔ پچھلے چار سال میں جزائر لکشدیپ کے ایڈمنسٹریٹر پرفل کھوڑا پٹیل نے ترقی کے نام پر کئی ایسے اقدامات کا اعلان کیا ہے، جن سے جزائر کی آبادی کے تناسب کو بگاڑنے اور مقامی آبادی کو اپنے ہی علاقے میں بیگانہ کرنے کی سازش کی بو آتی ہے۔ ۳۶ جزائر پر مشتمل لکشدیپ میں ۲۰۱۱ء کی مردم شماری کے مطابق ۶۴ ہزار ۴۲۹ نفوس رہتے ہیں اور ان میں ۹۶ فیصد مسلمان ہیں۔ یہ جزائر زبان، ثقافت اور رہن سہن کے اعتبار سے کیرالا صوبہ کا حصہ لگتے ہیں۔ ۱۹۴۷ء تک برطانوی عملداری میں مدراس پریزیڈنسی ان کو کنٹرول کرتی تھی۔ یہ علاقہ ٹیپو سلطان کی مملکت میں شامل تھا اور ان کی موت کے بعد برطانیہ کے قبضے میں آ گیا۔ آزادی کے بعد اس خدشہ کے پیش نظر کہ مسلم اکثریتی علاقہ ہونے کی وجہ سے یہ کہیں پاکستان میں شامل نہ ہو جائے، ملک کے پہلے وزیر داخلہ سردار پٹیل نے بحریہ کو فی الفور ان جزائر کا کنٹرول حاصل کرنے کا حکم دے دیا۔ بتایا جاتا ہے کہ چند روز بعد پاکستانی بحریہ اس علاقے میں پہنچی، مگر تب تک بھارتی فوج اس کا کنٹرول حاصل کر چکی تھی۔ ان کی ثقافت، مذہبی و نسلی شناخت اور ان کی زمین و جائیداد کی حفاظت کے لیے جزائر کے باشندوں کو شیڈیولڈ ٹرائب یعنی درج فہرست قبائلیوں کے زمرے میں رکھا گیا۔ ۱۹۷۱ء تک پاکستانی بحری جہازوں کو مشرقی بازو (بنگلا دیش) کی طرف سفر کرتے ہوئے اِن ہی جزائر کے پاس سے ہو کر گزرنا پڑتا تھا۔ چونکہ یہ جزائر بھارت کے ساحلوں کی طرف آتے ہوئے عرب تاجروں کی راہ میں پڑتے تھے، اس لیے لگتا ہے کہ یہ ان کا پڑاؤ ہوتا تھا۔ ۳۶ جزائر میں سے صرف ۱۰ میں ہی آبادی ہے۔ پانچ جزائر تو سیاحوں کے لیے بند ہیں، کیونکہ ان میں بحریہ کے اڈے ہیں۔ ایک غیر آباد جزیرہ بانگارام میں غیر ملکی سیاحوں کے لیے ریزورٹس کا انتظام ہے۔ یہ واحد جزیرہ ہے جہاں اب تک شراب نوشی کی اجازت تھی۔ بھارت کے ساحلی علاقوں میں یہ واحد جگہ ہے، جہاں تہہ در تہہ رنگا رنگ مونگے یعنی مرجان کی چٹانوں کے سلسلے موجود ہیں۔ سمندر کا پانی اتنا شفاف ہے کہ مٹر کا دانہ بھی گر جائے تو تہہ میں نظر آ جائے۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ ایک جارحانہ سیاحتی حکمت عملی کی وجہ سے ماحولیات کو انتہائی نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ ایڈمنسٹریٹر پرفل پٹیل جو گجرات میں مودی کے وزارت اعلیٰ کے دوران وزیر داخلہ رہ چکے ہیں، کا کہنا ہے کہ ان جزائر میں پچھلی کئی دہائیوں سے ترقی نہیں ہوئی ہے۔ اس لیے سیاحوں کو کھینچنے کے لیے سبھی جزائر میں شراب نوشی کی اجازت ہوگی۔ اب ان سے کوئی پوچھے ان کے اپنے صوبہ گجرات اور صوبہ بہار میں شراب نوشی کی کیوں ممانعت ہے؟ ترقی اگر شراب سے ہی ہوتی ہے، تو گجرات اور بہار میں بھی شراب بندی ختم کرنی چاہیے۔ اس کے علاوہ گائے کے گوشت کی خرید و فروخت اور کہیں لانے لے جانے پر پابندی اور اس کی خلاف ورزی کرنے والوں کے لیے سخت ترین سزائیں، دو سے زائد بچوں کے والدین کے پنچایت الیکشن میں حصہ لینے پر پابندی، غنڈہ ایکٹ کا نفاذ اور ترقی کے نام پر کسی کی بھی زمین حاصل کر لینے سے متعلق اعلانات شامل ہیں۔ درج فہرست قبائلی علاقہ کا درجہ ہونے کی وجہ سے ابھی تک باہر کے لوگ ان جزائر پر زمینوں کی خرید و فرخت نہیں کر سکتے تھے۔ لکشدیپ کے رکن پارلیمان محمد فیصل کا کہنا ہے کہ اس مجوّزہ قانون میں مقامی نمائندوں کو کسی بھی معاملے میں فیصلہ کرنے کا حق نہیں ہوگا بلکہ سارے اختیارات صرف ایک شخص کے ہاتھ میں چلے جائیں گے۔ کسی کو بھی اس کے خلاف عدالتی سماعت کے بغیر ایک برس تک جیل میں رکھا جا سکتا ہے۔ ایسی جگہ جہاں خود حکومتی اعداد و شمار کے مطابق جرائم برائے نام ہیں، جیل خالی ہے، وہاں ایسے سخت قانون کی کیا ضرورت ہے؟ لکشدیپ کو سیاحتی نقشہ پر لانے اور اس کو مالدیپ کے برابر کھڑا کرنے سے قبل حکومت کو ان جزائر کے باسیوں کے ساتھ احسن سلوک کرکے ان کو انسان مان کر ان کی نفسیات اور رسم و رواج کی پاسداری کرنی چاہیے۔ اگر ان جزائر کے باسیوں کو ہی اپنے گھر سے بے دخل کر دیا گیا تو اس سیاحت اور تعمیر و ترقی کا کیا فائدہ ہے۔

(بحوالہ: روزنامہ ''۹۲ نیوز'' کراچی۔ ۱۷ جنوری ۲۰۲۴ء)

رام مندر کی تعمیر: لمحۂ فکریہ؟

اپوروانند

۲۲ جنوری ہم سب کے لیے بہت اہم تھا۔ ہندوستان کے لیے یہ دن بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ نریندر مودی کے مطابق یہ دن محض کیلنڈر کا ایک دن نہیں بلکہ تاریخ کے ایک اہم باب کا آغاز ہے۔ مقدس ہستی کی جانب سے قوم کی طرف، رام کی طرف سے پوری قوم کی جانب ایک اہم پیغام۔ ان کا کہنا تھا کہ آج کے دن ہندوستان کے ایک ہزار سال کی تاریخ کی داغ بیل ڈال دی گئی۔ مودی کے یہ الفاظ رام راجیہ (الٰہی تعلیمات) اور ہندوستان کے سیکولر آئین سے صریح متصادم ہیں۔ لیکن اس کے باوجود میڈیا میں اس بیان کا خیر مقدم کیا گیا اور خوب اچھالا گیا۔

ایک مؤقر قومی اخبار نے یہ خبر لگائی ہے کہ ۲۲ جنوری تبدیلی کا آغاز، قوم کے اجتماعی شعور کی بیداری جب کہ ایک اور اخبار کی سرخی اس طرح تھی کہ ہندوستان کے لیے ایک اہم موقع کہ وہ اپنی سمت کا نئے سرے سے تعین کرے۔ ہندوازم ہندوستان کے لیے مرکزی اہمیت کا حامل ہے۔ لہٰذا مسلمانوں اور عیسائیوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس بات کا احترام کرتے ہوئے اپنی زندگیوں کو اپنی عقائد کے مطابق گزاریں۔ ۲۲ جنوری کو اس وجہ سے زیادہ اہمیت حاصل ہے کہ اس دن ایودھیا میں ہندوؤں کے سب سے زیادہ قابل احترام دیوتا رام مندر کی تعمیر کا آغاز ہوا ہے۔ ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ رام اتر پردیش کے ایک چھوٹے سے قصبے میں پیدا ہوئے، لہٰذا اس علاقے کو مذہبی اعتبار سے احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ ایودھیا میں سیکڑوں مندروں کو رام سے منسوب کیا گیا ہے۔ ۲۲ جنوری کو جس مندر کا آغاز کیا گیا ہے اسے ایک منفرد مقام حاصل ہے۔ اس کی تعمیر اس جگہ کی جارہی ہے جہاں مغلیہ دور کی بابری مسجد قائم ہے۔ یہ مسجد صدیوں سے اس جگہ قائم تھی، تاہم ۱۹۹۲ء میں بھارتی جنتا پارٹی کے کارندوں نے اسے منہدم کردیا تھا۔ ۱۶ویں صدی کی اس تاریخی مسجد کے انہدام سے ہندوستان کو تاریخ کے بدترین مذہبی فسادات کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اس واقعہ میں ۲۰۰۰ افراد مارے گئے تھے جن میں سے بیشتر مسلمان تھے۔ اس واقعے نے سیکولر ہندوستان کے سیاسی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔

۲۰۱۹ء میں سپریم کورٹ نے ایک فیصلے میں اس عمل کو قانون کی سنگین خلاف ورزی کہا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی رام مندر کی تعمیر کے حق میں بھی فیصلہ دیا تھا۔ یہ ایک عجیب غیر منطقی نوعیت کا فیصلہ تھا جس میں کہا گیا تھا کہ رام مندر کی تعمیر سے ہندو اکثریتی آبادی کے اشتعال کو کم کرنے میں مدد ملے گی، اس طرح معاشرے میں ہم آہنگی کی فضا پروان چڑھے گی۔ اس فیصلے پر قانونی ماہرین کی جانب سے بھارت اور بیرون ملک سے کافی ردعمل اور تنقید سامنے آئی اور اسے انصاف کے تقاضوں کے برخلاف فیصلہ قرار دیا گیا۔ اس سوال سے قطع نظر کہ اخلاقی اور قانونی حیثیت سے رام مندر کی تعمیر کا فیصلہ کیسا ہے، یہ واقعہ مسلمانوں اور ہندوؤں، دونوں کے لیے ناقابل فراموش ہے۔

مودی اور اس کے متشدد ہم نواؤں کی نظر میں یہ ہندوستان کی عظمتِ رفتہ کی نشانی ہے۔ وزیر داخلہ امیت شاہ نے اس موقع پر کہا کہ رام مندر کی تعمیر سے پرانے زخموں کو مندمل کرنے میں مدد ملے گی اور یہ ۵۰۰ سال پہلے مسلمانوں کی جانب سے کی گئی جارحیت کا بدلہ ہے اور اس عمل کو فتح سے تعبیر کیا۔

مسلمانوں کے لیے یہ واقعہ دراصل ہندوستان کا ہندو ریاست میں تبدیل ہوجانے سے عبارت ہے، جس کی بنیادوں میں مسلمانوں سے نفرت اور عصبیت موجود ہے۔ بابری مسجد کو منہدم کرنے والے شرپسند افراد اس طرح کے نعرے لگا رہے تھے کہ مسلمانوں کے لیے صرف دو صورتیں ہیں یا تو وہ پاکستان چلے جائیں یا پھر قبرستان اور بابر کی اولادوں کو جوتا مارو۔ مسلمان آج بھی ان افراد کو یاد کرتے ہیں جو اس فساد میں قتل یا معذور کردیے گئے یا جن کا بچپن ان سے چھین لیا گیا۔ یہی وجہ ہے ان کا درد اور غم محسوس کیا جاسکتا ہے۔ تقریباً تمام سیاسی جماعتوں نے مندر کی تعمیر کا خیر مقدم کیا ہے۔ بااثر افراد نے کھل کر اس کی حمایت کی ہے۔ ۲۲ جنوری کو پورے ملک میں رام مندر کی تعمیر کا جشن منایا گیا۔ بہت ساری جگہوں میں مسلمان مخالف نعرے بھی لگائے گئے۔ کچھ جگہوں پر فسادات کی اطلاع بھی موصول ہوئی۔

تاہم مودی کا کہنا تھا کہ اس عمل سے ملک کے اندر ہم آہنگی متاثر نہیں ہوگی۔ کچھ لوگ نفرت کو پروان چڑھانا چاہتے ہیں۔ میں ان لوگوں سے کہوں گا کہ وہ ایودھیا کے مندر آئیں اور یہاں کی روحانیت کو محسوس کریں۔ رام دراصل آگ نہیں بلکہ ایک روحانی طاقت ہے۔ رام مسئلہ نہیں بلکہ مسئلے کا حل ہے۔

اگرچہ یہ دعویٰ کہ رام مندر کی تعمیر سے ماضی کے تمام جھگڑے ختم ہوجائیں گے، اکثر لوگ اس سے اتفاق نہیں کرتے۔ خاص طور پر وہ سیاست داں جو مسلمان اور مغل حکمرانوں کی ہندوؤں کے خلاف زیادتیوں کا تذکرہ کرکے اپنے حمایتیوں کو یقین دلاتے ہیں کہ وہ ان سے انتقام لیں گے۔

رام مندر کی تعمیر سے ان افراد کی حوصلہ افزائی ہوگی جو اس کی انہدام میں شریک تھے۔ ان میں سے اکثر اپنے جرم کا اقرار ببانگِ دہل کرتے ہیں۔ بہت سے ریٹائرڈ جسٹس، فوجی افسران اور سول سرونٹس یہ کہتے نظر آتے ہیں کہ بابری مسجد کی تباہی میں وہ شریک تھے اور کھل کر اس کا جشن مناتے ہیں۔

۲۲ جنوری کی تقریبات کو منانے کے لیے بھارتی ایئرفورس کے طیاروں نے شرکا پر پھولوں کی پتیوں کو نچھاور کیا۔ یہ عمل ہندوستان کے مسلمانوں اور دیگر اقلیتوں کے لیے انتہائی تکلیف کا باعث تھا۔ اب یہ بالکل واضح ہے کہ ہندوستان اپنے اکثریتی ہندو ریاستی پالیسی پر سختی سے گامزن ہے۔

رام مندر ہندوتوا کے نظریے کا پرچارک ہے۔ اس کے ساتھ مودی کے ہندو اکثریتی ریاست کے عزائم بھی اس سے واضح ہوتے ہیں۔ رام مندر کی تعمیر سے مودی نے بڑی کامیابی سے اپنے عزائم کی تکمیل کے لیے قدم آگے بڑھائے ہیں، اس پر انہیں میڈیا کی بھرپور حمایت حاصل تھی۔

۲۲ جنوری کے اقدام سے مودی نے اپنے آپ کو ایک منتخب جمہوری نمائندے کے بجائے ایک آمر کی حیثیت سے پیش کیا۔ ریاست کے بنیادی اقدار اور اصولوں کی اس طرح پامالی تمام دردِ دل ہندوستانیوں کے لیے لمحہ فکریہ ہے۔

(ترجمہ: محمود الحق صدیقی)

"Why the new Ram temple in Ayodhya is a turning point for India". ("Aljazeera". Jan 25, 2024)

بقیہ: معاشی پیش گوئیاں غلط کیوں ثابت ہورہی ہیں؟

امور سے متعلق پیش گوئیوں کا اپنا نظام بہتر بنایا ہے۔ پرانے ماڈل چھوڑ کر ایسے طریقے اپنائے گئے جن میں دور اندیشی پائی جاتی ہے۔ پیٹر وینڈن ہاؤٹے کہتے ہیں کہ سبھی یہ جانتے ہیں کہ معاشی پیش گوئی کے پرانے ماڈل اب کارگر نہیں رہے۔ ان میں کمزوریاں بھی ہیں اور کمی بھی۔ اس حوالے سے غور وفکر کی ضرورت ہے تاکہ متعلقہ عوامل کو قبول کرنے کی ذہنیت کو پروان چڑھایا جاسکے۔

(ترجمہ: ابوصباحت)

"Economists pilloried for getting forecasts wrong". ("brecorder.com". February 4, 2024)

'اسرائیل نے کبھی دوریاستی حل کامیاب ہونے نہیں دیا'

اعزاز احمد چوہدری

غزہ میں جاری جنگ کے تین ماہ بعد اسرائیلی فوج کے ہاتھوں ہزاروں فلسطینی شہید ہو چکے ہیں، جن میں بڑی تعداد میں بچے بھی شامل ہیں۔ اس تباہی اور بربادی کے پیچھے اسرائیل کا بیان کردہ مقصد یہ ہے کہ وہ حماس کو ختم کرنا چاہتا ہے لیکن اس پر یقین نہیں کیا جاسکتا کیونکہ اسرائیل صرف حماس ہی نہیں بلکہ تمام فلسطینیوں کو نسل کشی جیسی اجتماعی سزا دے رہا ہے۔

تو کیا اسرائیل کا مقصد فلسطینیوں کو زبردستی پڑوسی عرب ممالک یا کسی اور جگہ پر دھکیل کر 'گریٹر اسرائیل' بنانا ہے؟ اگر یہ مقصد ہے تو اسرائیل یقینی طور پر اپنی وحشیانہ طاقت کے بارے میں غلط فہمی کا شکار ہے اور فلسطینیوں کے عزم و حوصلے کو کم سمجھ رہا ہے۔ یہ فلسطینی اس سرزمین کو نہ چھوڑنے کے لیے پُرعزم نظر آتے ہیں جہاں ان کے اجداد ہزاروں سال سے رہتے آرہے ہیں۔

فلسطین اسرائیل تنازع ایک پیچیدہ مسئلہ ہے۔ اس سرزمین کے دو دعوے دار ہیں یعنی یہودی اور فلسطینی۔ دونوں اس زمین پر اپنے دعوے کے لیے تاریخ کا حوالہ دیتے ہیں۔ اس تنازع کی بنیاد یورپ کے یہودیوں کو فلسطین میں بسانے کے لیے ۱۹۱۷ء میں برطانیہ کے اس فیصلے میں پنہاں ہے جسے اعلانِ بالفور کہا جاتا ہے۔

ایک بار جب یہودیوں کی کافی تعداد فلسطین پہنچ گئی اور مقامی عرب آبادی کو بے گھر کر دیا تو برطانیہ ۱۹۴۷ء میں اس معاملے کو اقوام متحدہ میں لے گیا جہاں دو الگ الگ ریاستوں، فلسطین اور اسرائیل کے قیام پر اتفاق ہوا۔ تاہم اسرائیل نے کبھی بھی دو ریاستی حل کو کامیاب ہونے نہیں دیا۔ اس کے بجائے اس نے بے بس فلسطینیوں پر نسل پرستی جیسا قبضہ مسلط کر دیا ہے۔

اس مسئلے کی ایک نظریاتی جہت بھی ہے۔ اسرائیل کی ریاست دنیا کے یہودیوں کے لیے بنائی گئی تھی۔ یہ نام خود حضرت اسحٰق کے بیٹے اور حضرت ابراہیم کے پوتے حضرت یعقوب سے آیا ہے۔ حضرت یعقوب کو اسرائیل بھی کہا جاتا تھا اور ان کی اولاد کو بنی اسرائیل کہا جاتا تھا۔ ان کے جانشینوں میں حضرت داؤد اور ان کے بیٹے حضرت سلیمان شامل تھے، دونوں نے اس علاقے میں بڑی سلطنتیں بنائیں۔ حضرت موسیٰ بنی اسرائیل کو بچا کر مصر سے اس سرزمین پر لے آئے۔

یہ تمام انبیاء مسلمانوں کے لیے یکساں مقدس ہیں۔ پھر یہاں مسجد اقصیٰ ہے جو کہ قبلہ اول تھی۔ حضور نبی اکرمؐ اسی مسجد سے معراج پر تشریف لے گئے تھے۔ اسرائیل کو کوئی حق نہیں ہے کہ وہ مسلمان فلسطینیوں کو اس سرزمین میں رہنے سے محروم کرے۔

اسرائیل 'اپنے دفاع' کے نام پر اپنے مظالم کا جواز پیش کرتا رہتا ہے۔ ۷ اکتوبر ۲۰۲۳ء کو ہونے والی حماس کی کارروائی کسی خلا میں نہیں ہوئی اور اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل نے بھی اس بات کا ذکر کیا ہے۔ فلسطینی عوام وحشیانہ قبضے کی زد میں ہیں۔ حماس کی کارروائی قابض قوت کے خلاف مزاحمتی کارروائی تھی جو کہ بین الاقوامی قوانین کے تحت جائز ہے۔

اسرائیل کی جانب سے فلسطینیوں کے گھروں، اسکولوں اور اسپتالوں کو بے دریغ نشانہ بنانے پر نہ صرف عرب یا مسلم ممالک میں بلکہ امریکا سمیت تمام ممالک میں زبردست احتجاجی مظاہرے ہوئے ہیں۔ اس کے باوجود اسرائیل ان آوازوں کو سننے کے لیے تیار نہیں۔ اسرائیل کے اس طرح کے شدید ردعمل کی ایک وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ حماس کے ممکنہ حملے سے بے خبر رہنے پر اسرائیل میں اندرونی طور پر تنقید ہو رہی ہے۔

مزید یہ کہ نیتن یاہو مضبوط نظر آنا چاہتے ہیں کیونکہ ان کی ملکی مقبولیت میں کمی آرہی ہے۔ امریکا کی حمایت نے بھی اسرائیلی قیادت کو حوصلہ دیا ہوگا۔ ایک اور وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ عرب اور مسلمان ممالک اسرائیل کے خلاف ٹھوس اقدامات جیسے کہ اسرائیلی مصنوعات کا بائیکاٹ کرنے یا سفارتی تعلقات منقطع کرنے کے لیے متحد نہیں ہوسکے۔

تاہم اب اسرائیل پر دباؤ بڑھ رہا ہے۔ امریکا فوری اور مستقل جنگ بندی کے لیے بین الاقوامی برادری کے مطالبات کو نظر انداز نہیں کرسکتا۔ کچھ یورپی ممالک، جیسے برطانیہ، اسرائیل کے ساتھ کھڑے ہیں، لیکن ان کے عوام غزہ میں شہریوں پر مسلسل بمباری کے خلاف احتجاج کر رہے ہیں۔ اسرائیل کو اس جنگ کا بھاری مالی نقصان بھی اٹھانا پڑ رہا ہے اور وہاں بہت سے کاروبار بند ہو چکے ہیں۔ اسرائیل کے لیے ایک بڑا دھچکا یہ ہے کہ عرب اسرائیل تعلقات معمول پر آنے کا عمل بھی رک گیا ہے۔

مشرق وسطیٰ میں امریکی اثر و رسوخ کو بھی دھچکا لگا ہے۔ خلیجی ممالک سمیت عرب دنیا اب اپنی سلامتی کی ضروریات کے لیے دوسرے آپشنز کی تلاش پر مائل نظر آرہی ہے۔ امریکا کو اس کے ویٹو کا اختیار استعمال کرنے پر بھی شدید تنقید کا نشانہ بنایا گیا کیونکہ اس ویٹو نے اقوام متحدہ کو غزہ میں جنگ بندی کے لیے کردار ادا کرنے سے روک دیا جبکہ اس اقدام کو ۱۵۳ ممالک کی حمایت حاصل تھی۔ اب وقت آگیا ہے کہ بائیڈن انتظامیہ اسرائیل کے لیے اپنی حمایت پر نظر ثانی کرے۔

فلسطینیوں کے غیر متزلزل عزم کے پیش نظر، نیتن یاہو کا ایک عظیم تر اسرائیل بنانے کا خواب پورا ہونے کا امکان نہیں ہے لیکن وہ اور ان کے انتہائی دائیں بازو کے ساتھیوں کا مقدر یقیناً تاریخ کی کتابوں میں سب سے زیادہ بے رحم اور سنگدل حکومت کے طور پر لکھا جانا ہے۔

پاکستان نے فلسطینیوں کے حق خود ارادیت کی مسلسل حمایت کی ہے۔ پاکستان نے بھی اسرائیل کو باضابطہ طور پر تسلیم نہیں کیا۔ ایسا کرنے کے لیے ملک میں کچھ آوازیں اٹھ رہی ہیں۔ تاہم غزہ کی حالیہ جنگ کے بعد پاکستان کے اسرائیل کو تسلیم کرنے کے امکانات اور بھی کم ہیں۔

"Complex conflict".

(Daily "Dawn" Karachi. January 7, 2024)

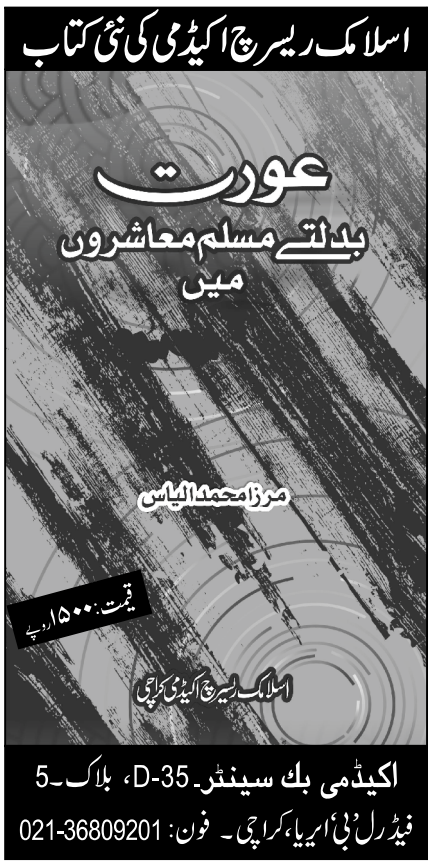

سال ۲۰۲۴ء دنیا بھر میں انتخابات کا سال

ماہر علی

تقریباً ۴۰ ممالک میں جو کہ تقریباً دنیا کی نصف آبادی کی نمائندگی کرتے ہیں، رواں سال عام انتخابات کا انعقاد ہوگا جہاں یہ یا تو اپنے نئے حکمرانوں کا انتخاب کریں گے یا پھر اپنے موجودہ حکمرانوں کو برقرار رکھیں گے۔ اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ ہم اسے جمہوریت کی عالمی کامیابی کے طور پر دیکھیں۔

سب سے پہلے بنگلا دیش میں انتخابات کا انعقاد ہوا ہے جبکہ دنیا بھر میں شروع ہونے والے انتخابی سلسلے کا اختتام ممکنہ طور پر ۵ نومبر کو سب سے زیادہ نتیجہ خیز انتخابات کے ساتھ ہوگا جہاں امریکی عوام حقِ رائے دہی کا استعمال کرتے ہوئے فیصلہ کریں گے کہ آیا ڈونلڈ ٹرمپ اقتدار میں واپس آتے ہیں یا نہیں۔

اس مدت کے دوران میکسیکو اور دیگر ممالک کے ساتھ ساتھ بھارت، انڈونیشیا، پاکستان اور روس میں بھی پولنگ ہوگی۔ ۲۰۲۵ء تک برطانیہ میں انتخابات ہونے تو نہیں لیکن رشی سوناک کی اقتدار سے جلد بے دخلی کی توقع ہے کیونکہ ان کی پارٹی کے مستقبل کے امکانات خراب ہونے کا خدشہ ہے۔

اگرچہ بن یامین نیتن یاہو غزہ میں نسل کشی کی مہم میں توسیع کر سکتے ہیں تاکہ مایوس ووٹرز نیتن یاہو کی فاشسٹ حکومت کی لاتعداد ناکامیوں کا حساب نہ لے سکیں لیکن اسرائیلی جارحیت میں توسیع ایسے حالات کو بھڑکا سکتی ہے جن میں انتخابات کی ضرورت ہو۔

اسرائیل کے زیرِ قبضہ علاقوں میں خونریزی کے اثرات امریکی انتخابات پر بھی مرتب ہوں گے۔ اس بات کے شواہد موجود ہیں کہ نوجوان امریکی بشمول یہودی مایوس ہیں کہ بائیڈن انتظامیہ کی طرف سے مشرق وسطیٰ میں سیکڑوں شہریوں کی خونریزی کرنے والے عناصر کو امداد فراہم کی جارہی ہے جبکہ اس قتلِ عام میں زیادہ تر بچے اور خواتین نشانہ بن رہے ہیں، یوں ہر روز وہ بائیڈن کو دوبارہ منتخب کرنے کے اپنے فیصلے کے حوالے سے تذبذب کا شکار ہوتے ہیں۔

دوسری جانب صہیونی حمایت یافتہ لابی اور ان کے ساتھی، کانگریس کے اُن چند ارکان کو شکست دینے کے لیے پُرعزم ہیں جنہوں نے فلسطینیوں کے حقوق کے لیے بات کرنے کی جرأت کی یا جو اسرائیل کے جنگی جرائم کے ارتکاب میں امریکی سہولت کاری پر سوال اٹھاتے ہیں۔ البتہ اس ضمن میں گزشتہ کوششوں کی کامیابی کی شرح انتہائی کم رہی ہے لیکن اس کے باوجود یہ رجحان ایک ایسے ملک میں تشویش کا باعث ہے جہاں انتخابی مقابلوں میں اکثر پیسے کا راج ہوتا ہے۔

اس سے آگے جائیں تو اس بات کی کوئی ضمانت نہیں ہے کہ قانونی یا آئینی چیلنجز ٹرمپ کے لیے دوسری دفعہ صدر بننے کی کوشش کو ناکام بنا دیں گے۔ کیا وائٹ ہاؤس میں ان کی واپسی جادو کا کام کرے گی جیسا کہ امریکی میڈیا کے کچھ حلقے تاثر پیش کرتے ہیں؟ شاید ایسا ہو۔ دنیا کی خوفناک صورتحال، اسٹیٹس کو پر اکسانے کا کام کرے گی لیکن ڈونلڈ ٹرمپ کا دوسرا دورِ صدارت مزید پریشان کن امکانات پیدا کر سکتا ہے۔

تاہم امکانات یہی ہیں کہ ناپسندیدہ واقعات رونما ہوں گے۔ برصغیر کی بات کی جائے تو یہاں جبر ایک عام عنصر بنتا جارہا ہے۔ بنگلا دیش میں عوامی لیگ (ایسا لگتا ہے کہ حسینہ واجد نے اس جبر کا انتخاب کرنے کے بعد اپنے والد کے حالات کو بھلا دیا ہے)، پاکستان میں مقتدر حلقے اور بھارت میں مودی حکومت ایک بار پھر ممکنہ طور پر دوبارہ اقتدار سنبھالیں گی۔

مختلف وجوہات کی بنا پر تینوں کے کامیاب ہونے کا امکان ہے۔ پرابوو سوبیانتو کا انڈونیشیا کے اگلے صدر بننے کا امکان ہے جو کہ سہارتو دور کے جنرل ہیں جن کے مظالم کی وجہ سے ان پر امریکا میں داخلے پر پابندی عائد ہے۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر وہ جیت جاتے ہیں تو یہ پابندی ہٹا دی جائے گی، بالکل ویسے ہی جیسا کہ نریندر مودی کے معاملے میں ہوا تھا۔

جنوبی افریقا میں افریقن نیشنل کانگریس (اے این سی) جو نیلسن منڈیلا کے ساتھ انمٹ طور پر وابستہ ہیں لیکن ان کے نظریات کی درست عکاسی نہیں کرتی، برسوں کی ناقص حکمرانی اور بدعنوانی کے بعد اپنی اکثریت سے محروم ہو سکتی ہے۔ اگرچہ اپنی تمام خامیوں کے باوجود اے این سی نے فلسطینیوں کی آزادی کے مقصد کی مسلسل حمایت کی ہے اور اس کی حکومت بین الاقوامی عدالت میں اسرائیلی نسل کشی کے خلاف مقدمہ لے جانے پر تعریف کی بھی مستحق ہے۔

یورپ میں انتخابی رجحان وسیع طور پر دائیں اور انتہائی دائیں بازو کی جانب ہے۔ اس کی جزوی طور پر یہ وجہ بھی ہے کہ بائیں بازو کا اثر ختم ہو رہا ہے۔ لاطینی امریکا بائیں یا دائیں کا واضح انتخاب پیش کرتا ہے۔ جیت جس کی بھی ہو، میکسیکو میں اس سال پہلی خاتون صدر آنے والی ہیں۔ روس میں ولادیمیر پیوٹن کے تمام ممکنہ متبادل کو قید یا جلاوطن کر دیا گیا ہے، پھر بھی قانونی حیثیت فراہم کرنے کے لیے ایک جعلی انتخابی مشق کو ضروری سمجھا جارہا ہے۔ جنگ زدہ یوکرین اس سال ہونے والے انتخابات سے اثر انداز نہیں ہوگا۔ اگر اس نے فلسطینیوں کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا ہوتا تو یوکرین کو بہت زیادہ حمایت حاصل ہوتی لیکن ولادیمیر زیلنسکی نے یہ کام پیوٹن پر چھوڑ دیا۔

مبینہ طور پر چینی مداخلت کی وجہ سے تائیوان میں اگلے ہفتے ہونے والے صدارتی انتخابات نہ صرف تائیوان بلکہ اس خطے کی قسمت کا تعین کر سکتے ہیں۔ اس کی بنیاد اس بات پر ہوگی کہ جیتنے والے کا چین کے حوالے سے کیسا رویہ ہوتا ہے۔

کسی بھی انتخابی نتیجے سے کرہ ارض کو موسمیاتی تباہی سے بچانے کا امکان نہیں ہے۔ جبکہ تعیّشات اور امارت کے ساتھ دنیا میں شدید غربت، بھوک اور بے گھری بھی موجود ہے۔ دائیں بازو کی قوتیں بھی یہی کچھ پیش کر سکتی ہیں جبکہ دنیا کے بیشتر حصوں میں بائیں بازو کی قوتیں یا تو ختم ہو چکی ہیں یا پھر بہت کم ہیں۔ آپ کو نیا سال مبارک ہو، لیکن کیا یہ سال واقعی مبارک ہوگا؟

"Election year".

(Daily "Dawn" Karachi. January 3, 2024)

اسلامک ریسرچ اکیڈمی کی شائع کردہ نئی کتاب

اکیڈمی بک سینٹر۔ فون: 021-36349840

ٹنل فارمنگ کا اُمید افزا راستہ

پاکستان زرعی ملک ہونے کے ناطے خوراک کی پیداوار میں خودکفیل ہو، یہ ناگزیر ہے۔ پاکستان بھر میں انتہائی زرخیز زمینیں بھی ہیں اور غیر معمولی لگن سے کام کرنے والے کاشت کار بھی۔ ایسے میں ملک کا خوراک سمیت بیشتر فصلوں میں خودکفیل نہ ہونا محض افسوسناک ہی نہیں بلکہ شرمناک بھی ہے۔ ایسی باتوں پر دنیا کو ہنسنا ہی چاہیے۔ ایک طرف شاندار محلِ وقوع اور دوسری طرف زمینی ساخت محض موزوں نہیں بلکہ اُس سے کہیں بڑھ کر۔ پھر ہم کچھ خاص نہیں کر پا رہے۔

دنیا بھر میں زراعت کے لیے جدید ترین ٹیکنالوجی سے استفادہ کیا جارہا ہے۔ ہمارے ہاں اب تک اس کے لیے ذہن سازی کی ہی نہیں گئی ہے۔ کوئی اپنی ذاتی تحریک کی بنیاد پر کچھ کر گزرے تو اور بات ہے۔ سوال یہ ہے کہ متنوع قدرتی وسائل سے مالا مال ہونے کے باوجود ہم کچھ خاص کیوں نہیں کر پا رہے۔

زرعی امور کے ممتاز ماہر حسن علی نے کہا ہے کہ پاکستان میں زرعی شعبے سے وابستہ افراد اب تک روایتی طریقوں کے علم بردار ہیں۔ وہ روایتی طریقوں سے کاشت کاری کر رہے ہیں۔ ایسے میں غیر معمولی پیداوار کا محض خواب دیکھا جاسکتا ہے۔ دنیا کہیں سے کہیں پہنچ گئی ہے اور ہم اب تک ہزار بارہ سو سال پہلے کی دنیا میں جی رہے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ زیادہ محنت کرنے سے بھی پیداوار نہیں بڑھ پا رہی۔ ایسے میں لازم ہے کہ کاشت کاری کے جدید ترین طریقے اپنائے جائیں۔ زمینوں کو اس طور بروئے کار لایا جائے کہ پیداوار میں اضافہ بھی ہو اور فصلوں کا تنوع بھی حاصل ہو۔ لازم ہو چکا ہے کہ پاکستان میں بھی اب ٹنل فارمنگ جیسے انقلابی طریقے اپنائے جائیں تاکہ فی ایکڑ پیداوار میں غیر معمولی اضافہ ہو اور کاشت کاروں کو ان کی محنت کا صلہ مل سکے۔

''ویلتھ پی کے'' سے گفتگو میں حسن علی نے کہا کہ ٹنل فارمنگ یا انڈور فارمنگ چین نے متعارف کرائی اور پروان چڑھائی ہے۔ کاشت کاری کے اس طریقے نے چین میں پیداوار کے اعتبار سے ہی نہیں بلکہ لاگت کے حوالے سے بھی انقلاب برپا کر دیا ہے۔ چین نے سی پیک منصوبوں کے تحت مختلف شعبوں میں پاکستان کی غیر معمولی معاونت کی ہے۔ پاکستان ٹنل فارمنگ کے حوالے سے چینی کاشت کاروں کے تجربے اور مہارت سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے انقلاب برپا کرسکتا ہے۔ اس طریقِ کار پر عمل کرنے سے مطلوبہ فصل کنٹرولڈ ماحول میں خاصی کم رقم خرچ کرکے حاصل کی جاسکتی ہے۔

حسن علی کہتے ہیں کہ پاکستان میں انتہائی باصلاحیت اور پُرعزم نوجوانوں کی کمی نہیں۔ مناسب راہنمائی میسر نہ ہونے کے باعث ہماری نئی نسل کچھ خاص کرنے کے قابل نہیں ہو پا رہی۔ باصلاحیت پاکستانی نوجوانوں کو مختلف شعبوں میں معقول تربیت فراہم کرنے کے حوالے سے حکومت کو چین سے بات کرنی چاہیے۔ زرعی شعبے میں جدید ترین آلات سے کام لیتے ہوئے وہ سب کچھ حاصل کیا جاسکتا ہے جو اس وقت ذہنوں میں ہے۔ کاشت کاری سے وابستہ ہمارے نوجوانوں کو زرعی شعبے کے جدید ترین آلات کے موثر استعمال کی تربیت حاصل کرنا ہوگی۔ اس معاملے میں چین کلیدی کردار ادا کرسکتا ہے۔

زرعی امور کے ایک اور معروف ماہر ڈاکٹر ندیم کا کہنا ہے کہ چین کے زرعی امور کے ماہرین نے مرچ کی کاشت کے حوالے سے پاکستانی کاشت کاروں کو تربیت دی جس کے بعد پاکستان نے لال مرچوں کی پہلی کنسائنمنٹ گزشتہ ماہ چین بھیجی۔ یہ خاصی حوصلہ افزا خبر ہے۔ ہمارے ہاں زرخیز زمینوں کی کمی نہیں۔ کاشت کاری کے جدید ترین طریقے اختیار کرنے سے ہم اپنی زمینوں کی پیداوار میں کئی گنا اضافہ کرسکتے ہیں۔ چین نے جدید ترین طریقوں سے کاشت کاری کو فروغ دے کر یہ انقلاب برپا کیا ہے۔ وہاں پیوند کاری بھی بڑے پیمانے پر ہوئی ہے جس کے نتیجے میں عام سی چیزوں کی دُگنی تِگنی پیداوار ممکن بنائی گئی ہے۔

پاکستانی کاشت کار مرچ، ٹماٹر، تربوز، ککڑی، کھیرا، کریلا، خربوزہ اور دوسری بہت سی فصلوں کی پیداوار میں حیرت انگیز حد تک اضافہ یقینی بنانے کے لیے چینی کاشت کاروں کے تجربے سے مستفید ہوسکتے ہیں۔ اس حوالے سے حکومتی سطح پر گفت وشنید کی ضرورت ہے۔

چین نے زرعی شعبے کو فروغ دینے کے لیے بہت محنت کی ہے۔ یہ ناگزیر تھا۔ چین کی آبادی کم وبیش ڈیڑھ ارب ہے۔ اتنی بڑی آبادی کے لیے یومیہ بنیاد پر دو یا تین وقت کی خوراک کا اہتمام کرنا کوئی بچوں کا کھیل نہیں۔ یہ کام سنجیدگی بھی مانگتا ہے اور بھرپور لگن بھی۔ چین میں زرعی شعبے میں تحقیق کے ذریعے پیوند کاری اور دوسرے طریقوں کو بروئے کار لاکر عام سی زمینوں سے غیر معمولی پیداوار حاصل کرنا ممکن بنایا گیا ہے۔ جو کچھ چین کے لیے ناگزیر تھا، وہ ہمارے لیے بھی اب ناگزیر کے درجے میں ہے۔ کاشت کاری کے جدید ترین طریقوں سے استفادہ نہ کرنے کا نتیجہ یہ برآمد ہوا ہے کہ ہمیں ہر سال بہت سی غذائی اجناس درآمد کرنا پڑتی ہیں۔ کبھی پیاز، کبھی ٹماٹر، کبھی دالیں اِدھر اُدھر سے لینا پڑتی ہیں۔ زرعی ملک ہونے کے باوجود، زرخیز زمینوں کا حامل ہونے کے باوجود پاکستان اگر خوراک بھی درآمد کر رہا ہے تو یہ شرمناک نہیں تو کیا ہے؟

ڈاکٹر ندیم مزید کہتے ہیں کہ پنجاب میں دسمبر اور جنوری کے دوران کاشت کاروں کے پاس سبزیاں اگانے کے سوا آپشن نہیں ہوتا۔ موسم کی شدت فصلوں پر بہت حد تک اثر انداز ہوتی ہے جس کے نتیجے میں پیداوار گھٹتی ہے اور پھر کاشتکار شدید سردی یا شدید گرمی میں ڈھنگ سے کام بھی نہیں کر پاتے۔ ایسے میں ایک اچھا تصور یہ ہے کہ گرمیوں میں سبزیوں کی زیادہ پیداوار حاصل کرنے کے لیے ٹنل فارمنگ اپنائی جائے۔

ٹنل فارمنگ میں کھیت کو پلاسٹک شیٹس سے پوری طرح ڈھانپ دیا جاتا ہے جس کے نتیجے میں اندرونی درجہ حرارت زیادہ نہیں گرتا اور موسمی اثرات قبول کیے بغیر فصل پروان چڑھتی رہتی ہے۔ کاشت کاری کا یہ طریقہ اپنانے سے فصلوں کو بارش کے دوران بھی نقصان سے بخوبی بچایا جاسکتا ہے۔ ڈاکٹر ندیم کا کہنا ہے کہ ٹنل فارمنگ نے چند فصلوں کی پیداوار کو دُگنا، بلکہ تِگنا کر دیا ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ چین سمیت کئی ممالک میں ٹنل فارمنگ نے انقلاب برپا کیا ہے۔ فی ایکڑ پیداوار بڑھنے سے کاشت کاروں کی غیر معمولی حوصلہ افزائی ہوئی ہے۔

حسن علی نے بتایا ہے کہ چین کے تیانجن ماڈرن ووکیشنل ٹیکنالوجی کالج نے ملتان کی زرعی یونیورسٹی کے ساتھ مفاہمت کی ایک یادداشت پر دستخط کیے ہیں۔ چینی کالج پاکستان میں زرعی پیداوار میں اضافہ ممکن بنانے کے لیے جدید ترین ٹیکنالوجی فراہم کرے گا اور متعلقہ تربیت فراہم کرے گا۔

حسن علی کا کہنا تھا کہ جو کچھ ملتان میں ہوا وہ پورے پاکستان میں ہونا چاہیے۔ چین کے تجربے سے مستفید ہوتے ہوئے ہم اپنی زرعی پیداوار کا گراف اس قدر بلند کرسکتے ہیں کہ کہیں سے کوئی چیز درآمد نہیں کرنا پڑے گی۔ جدید ترین ٹیکنالوجی اپنائے بغیر زراعت کے حوالے سے ملک کا مستقبل محفوظ نہیں بنایا جاسکتا۔

نئے طریقوں سے کاشت کاری میں مصروف کاشت کار انصار علی کا کہنا ہے کہ ٹنل فارمنگ خاصا موثر طریقہ ہے مگر اب بھی لوگ روایتی طریقے ترک کرنے کو تیار نہیں۔ اس حوالے سے ذہن سازی پر متوجہ ہونے کی ضرورت ہے۔ حکومت کو

میڈیا کے ذریعے کاشت کاروں کو ٹنل فارمنگ کا طریقہ اپنانے کی تحریک دینی چاہیے۔ ٹنل فارمنگ کے ذریعے سستی اور زیادہ پیداوار حاصل کی جاسکتی ہے مگر ہمارے کاشت کاروں کو اس کے لیے تربیت نہیں دی جارہی اور وہ خود بھی تربیت پانے کے لیے زیادہ بے تاب دکھائی نہیں دے رہے۔

انصار علی کا کہنا تھا کہ ٹنل فارمنگ کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ کسی بھی چیز کی پیداوار سال بھر حاصل کی جاسکتی ہے۔ ہمارے ہاں بعض اوقات چند ماہ کے لیے زمینیں بے کار پڑی رہتی ہیں۔ وقت اور فصل کے ضیاع کو روکنے میں ٹنل فارمنگ کلیدی کردار ادا کرسکتی ہے۔

بہت سے کسان بنیادی ڈھانچے کی زیادہ لاگت کے باعث ٹنل فارمنگ کی طرف نہیں آتے تاہم یہ نکتہ نظر انداز کیا جارہا ہے کہ ٹنل فارمنگ کی صورت میں زیادہ نگرانی کی ضرورت نہیں پڑتی۔ ٹنل فارمنگ کا بنیادی ڈھانچا اگر تھوڑا خرچہ مانگتا ہے، تب بھی کوئی بات نہیں کیونکہ آگے چل کر اس کے ذریعے دُگنی، تگنی پیداوار بھی تو حاصل کی جاسکے گی۔

ڈاکٹر ندیم کا کہنا تھا کہ ایک بڑا مسئلہ یہ بھی ہے کہ نئی نسل زراعت کو کیریئر کے طور پر اپنانے کے لیے تیار نہیں۔ میڈیا کے ذریعے نئی نسل کو شاندار مستقبل یقینی بنانے کے سوراستے دکھائی اور سُجھائے جاتے ہیں مگر زرعی شعبے کی طرف متوجہ ہونے کی تحریک نہیں دی جاتی۔ بہت سے ہنر بھی اب تک عدم توجہ کا شکار ہیں۔ نئی نسل سے پوچھیے کہ کیا بننے کا شوق ہے تو وہ سو شعبے گنوائے گی، کوئی یہ نہیں کہے گا کہ وہ الیکٹریشن، پلمبر، درزی یا کسان بننا چاہتا ہے۔ کاشت کاری بھی ایک مستند شعبہ ہے۔ کاشت کاری سے جڑے ہوئے شعبوں میں ڈیری فارمنگ اور فش فارمنگ بھی کم اہم شعبے نہیں۔ اس حوالے سے نئی نسل کا ذہن تیار کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ اُسے بتایا جانا چاہیے کہ ایک اچھا کسان بھی شاندار کیریئر کا حامل ہوسکتا ہے، کھیتی باڑی اور اُس سے جڑے ہوئے شعبوں کو بھی باوقار اور بارآور کیریئر کے طور پر اپنایا جاسکتا ہے۔

ٹنل فارمنگ زیادہ پیداوار حاصل کرنے اور کم افرادی قوت کے باوجود ڈھنگ سے کام کرتے رہنے کا اچھا طریقہ ہے۔ زراعت کا مستقبل ٹنل فارمنگ سے وابستہ ہے اور چین اس شعبے میں بہت تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے۔ اُس کے تجربے سے وسیع پیمانے پر مستفید ہونے کی ضرورت ہے۔ پاکستان میں فطری ماحول لاجواب ہے۔ یہاں زرخیز زمینیں بھی ہیں اور دریا بھی۔ پہاڑ بھی ہیں اور جھیلیں بھی۔ میدان بھی ہیں اور جنگل بھی۔ لازم ہے کہ قدرت کی فیاضی سے خوب مستفید ہوا جائے۔

سوال صرف ٹنل فارمنگ کا نہیں۔ زراعت اور اُس سے جڑے ہوئے ہر شعبے میں نئی سوچ اپنانے کی ضرورت ہے۔ نئی نسل کو اس طرف لانا ہوگا تاکہ چند شعبوں پر دباؤ گھٹے اور ہمارے نوجوان قدرتی ماحول میں بھی کیریئر بنانے کے بارے میں سوچنا شروع کریں۔ اس حوالے سے ایسا ماحول پیدا کرنے کی ضرورت ہے، جس میں نئی نسل برین اسٹارمنگ کی عادی ہو۔ کیریئر ایک بار کا فیصلہ نہیں۔ بھرپور زندگی کے لیے کیریئر بدلنا بھی پڑتا ہے اور اپنے آپ کو تکنیکی پیشرفت سے ہم آہنگ بھی رکھنا پڑتا ہے۔ یہ سب کچھ ناگزیر ہے، اس لیے عدم توجہی کوئی اچھا راستہ نہیں۔ (ترجمہ: ابوصباحت)

"Chinese tech to revolutionise tunnel farming in Pakistan". ("nation.com.pk". January 26, 2024)

چین بھارت رسّہ کشی اور خطّے کے ممالک

نعیمہ احمد مہجور

جنوبی ایشیا سے متعلق مختلف تھنک ٹینکس کی تجزیاتی رپورٹوں میں یہ خیال تقویت پکڑ رہا ہے کہ بھارت کے بیشتر پڑوسی ممالک جن پر بھارت کا خاصا اثر و رسوخ پایا جاتا تھا، آج کل اپنی معیشت کی بہتری کے لیے چین کی جانب دیکھ رہے ہیں یا چین کے قریب آچکے ہیں۔

چین نے پورے خطے میں ون بیلٹ ون روڈ کے منصوبے کے تحت بیشتر ملکوں میں اپنے منصوبوں کا ایک وسیع تر جال بچھایا ہوا ہے۔ گو کہ مغربی ممالک چین کو معاشی طور پر کمزور کرنے کے لیے بھارت کو استعمال کرنا چاہتے تھے اور اسے جنوبی ایشیا میں بڑے بھائی کے طور پر اجاگر کرنے کی کوشش میں تھے مگر جنوبی ایشیا پر چین کا اتنا گہرا اثر نظر آرہا ہے کہ مغرب کی یہ خواہش دم توڑ رہی ہے، وہ چاہے مالدیپ ہو، برما ہو، سری لنکا یا بنگلادیش۔

چند ہفتے پہلے مالدیپ کے نئے منتخب صدر محمد معیز و نے نہ صرف اپنی انتخابی مہم میں 'بھارت آؤٹ' کا نعرہ دیا تھا بلکہ صدارت سنبھالنے کے فوراً بعد چین کا دورہ کرکے دس سے زائد معاہدوں پر دستخط کرکے واپس بھی آئے۔ حال ہی میں بھارت کو ۱۵ مارچ سے پہلے ۵۰ سے زائد فوجی اور ایک دو فوجی ہیلی کاپٹر ملک سے واپس بلانے کا الٹی میٹم بھی دے دیا۔

چین نے بغیر تامل کے مالدیپ کی سمندری حدود میں اپنی موجودگی کو بڑھانے اور دفاعی مدد کا وعدہ کیا، جس پر بھارت کے دفاعی ماہرین نے تشویش کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ چین بھارت کو زمینی اور سمندری سرحدوں کے اندر گھیرنے کی تاک میں ہے۔ مالدیپ پانچ لاکھ نفوس پر مشتمل اگرچہ چھوٹا سا جزیرہ ہے مگر بحیرہ عرب میں اس کی خاصی اہمیت قرار دی جارہی ہے۔

برما اور بھارت کے تعلقات سطحی طور پر بہتر لگ رہے ہیں مگر دونوں ملکوں کے درمیان اُس وقت کشیدگی دیکھی گئی جب گزشتہ سال جنوری میں برما کی جانب سے بھارت کی سرزمین پر کچھ بم گرائے گئے۔ میانمار کے فوجی حکمرانوں نے کہا تھا کہ اس نے اپنی حدود میں جمہوریت نواز گروہوں کو نشانہ بنایا ہے۔

اس سے قبل بھارت نے میانمار سے ملنے والی شمال مشرقی ریاستوں کی اپنی سرحدوں کو مستحکم کرنے کے منصوبے پر عمل درآمد شروع کیا تھا۔ بھارت کے اندر گرنے والے بموں کی خبر کو میڈیا نے گول کردیا۔

شمال مشرقی ریاستوں کے مختلف نسلی گروپوں اور میانمار کے بعض گروپوں میں کافی قربت ہے اور ان کا سرحد پار کرنا اتنا مشکل نہیں تھا جتنا اب بنادیا گیا ہے، جب سے بھارتیہ جنتا پارٹی (بی جے پی) کی سرکار نے روہنگیا مسلمانوں کے بھارت میں داخلے پر بندشیں اور یہاں سے واپس جانے کی مہم کو تیز کردیا ہے۔

البتہ مبصرین کے مطابق میزورم اور میانمار کی سرحد اسلحہ، منشیات اور شدت پسندوں کی اسمگلنگ کے لیے آج بھی استعمال کی جاتی ہے۔ میانمار کی فوجی حکومت کی مبینہ زیادتیوں پر چین نے اگر چپ سادھ رکھی ہے تو جمہوری کہلانے والے ملک بھارت نے بھی خاموشی اختیار کی ہے۔

حالیہ برسوں میں میانمار اور چین میں دوستی کے نتیجے میں بھارت تذبذب میں ہے مگر وہ اس کا اظہار نہیں کرتا۔

نیپال پر بھارت کا خاصا اثر و رسوخ ہے، وہ چاہے مذہب کی یگانگت کی وجہ سے ہے یا ثقافتی ہم آہنگی کے باعث، جسے وزیراعظم نریندر مودی نے ۲۰۲۲ء کے دورہ نیپال کے دوران اس وقت مزید گہرا بنانے کی کوشش کی جب

انہوں نے لمبنی میں مہاتما بدھ کی جائے پیدائش پر بدھ وہار بنانے کا سنگ بنیاد رکھا۔

۲۰۲۰ء میں نیپال کی حکومت نے دونوں ملکوں کے درمیان چار سو کلومیٹر کی کالا پانی سرحد کے بارے میں دوبارہ سوال اٹھایا، جب بھارت نے لپولیکھ درے کے قریب ۸۰ کلومیٹر سڑک کا افتتاح کیا تھا، جو چین کی سرحد سے ریاست اتراکھنڈ کے دھرچولا کو ملاتی ہے۔ نیپال نے بھارت کے سفارت کار کو بلا کر اس پر تشویش کا اظہار کیا تھا اور آئینی ترامیم کے ذریعے اس سرحد پر اپنا حق جتانے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔

بروکنگز انسٹی ٹیوٹ کے مطابق سڑک کے افتتاح کے پیچھے دراصل بھارت کا ہاتھ تھا، جس کا مقصد نیپال کے بھارت نواز وزیر اعظم اولی کو ایک طرح سے لائف لائن فراہم کرنا تھا، جنہیں اندرونی طور پر سخت اپوزیشن کا سامنا تھا۔

بھارت کے خلاف وزیر اعظم اولی کی آواز اٹھانے سے اپوزیشن کا پارہ کم ہو گیا، جس نے فوراً آئینی ترامیم کرنے کا ساتھ دے دیا۔ اپوزیشن بھارت مخالف تھی، اس وقت نیپال کی سڑکوں پر زبردست مظاہرے ہوئے جو بھارت کی ایما پر ہو رہے تھے۔

بنگلا دیش میں حالیہ متنازع انتخابات میں شیخ حسینہ کے چوتھی بار وزیر اعظم بننے کے فوراً بعد بھارت پہلا ملک ہے جس نے انہیں مبارک باد دے کر دونوں ملکوں کے بیچ باہمی تعلقات کو مزید قریب لانے پر زور دیا۔ بھارت کی پالیسی 'ایکٹ ایسٹ' کے تحت بنگلا دیش ترجیحات میں پہلا ملک ہے، جسے چین کی توسیع پسندی اور اثر و رسوخ کو روکنے میں استعمال کیا جا رہا ہے۔ دونوں ملکوں نے سرحد پر دریاؤں کے پانی کی تقسیم کاری پر دو سال پہلے ایک بڑا معاہدہ کیا، جس کو ۱۹۹۶ء کے بعد ہونے والے ''گنگا واٹر ٹریٹی'' کا دوسرا بڑا معاہدہ قرار دیا گیا تھا۔

بھارت اور بنگلا دیش کے بیچ چار ہزار کلومیٹر سے زائد زمینی سرحد اور ۵۴ مشترکہ دریاؤں کے باعث دونوں کا ایک دوسرے پر انحصار ہے۔ شیخ حسینہ نے بھارت، میانمار، تھائی لینڈ کے درمیان ۱۴۰۰ کلومیٹر کی شاہراہ کے تکونی پروجیکٹ میں شراکت داری کا اظہار کیا ہے جس پر ابھی کوئی فیصلہ نہیں ہوا ہے، البتہ ٹیسٹا دریا دونوں ملکوں کے بیچ ایک بڑی رکاوٹ کے طور پر ابھر رہا ہے، دوسرا مسئلہ روہنگیا تارکین وطن کا ہے، جس پر شیخ حسینہ انسانی بنیادوں پر بھارت کی ثالثی سے میانمار کے ساتھ مسئلے کا تدارک چاہتی ہیں۔

بھارت میں ہندوتوا کی مسلمانوں کے خلاف نفرت اور ہجومی تشدد کے واقعات پر شیخ حسینہ نے کئی بار تشویش کا اظہار کیا ہے، اندرون ملک اس پر مظاہروں کے علاوہ کچھ اموات بھی ہوئی ہیں، جنہیں روکنے کے لیے حکمران جماعت کے بھارت مخالف شدید بیانات سامنے آئے۔

ڈھاکا میں بھارت بنگلا دیش امور کے ماہر رمیض چوہدری کہتے ہیں کہ 'امریکا نے چند ہفتے قبل بنگلا دیش میں انسانی حقوق کی مبینہ پامالیوں اور متنازع انتخابات پر کئی سوالات اٹھائے ہیں، ملک میں چین کی بڑھتی ہوئی سرمایہ کاری پر خفیہ طور پر تحفظات کا اظہار بھی کیا جا رہا ہے۔ دو سال میں چین نے وہاں ۱۲ شاہراہیں، ۲۱ پل اور ۲۷ بجلی کے منصوبے مکمل کیے ہیں۔ بیلٹ اینڈ روڈ منصوبے میں اہم فریق کے طور پر بنگلا دیش کا بھارت پر انحصار کم ہوتا جا رہا ہے، جس پر بھارت سے زیادہ مغرب کو پریشانی لاحق ہو رہی ہے'۔

سری لنکا پہلے ہی بھارت کی گرفت سے کسی حد تک باہر آ چکا ہے جہاں چین نے ملک کی معیشت کو سنبھالا دینے کے لیے اپنا ہاتھ بڑھایا ہے، خاص طور پر سمندری حدود میں اس کی موجودگی اہم تصور کی جا رہی ہے۔

حال ہی میں چین اور سری لنکا کے درمیان ایک معاہدے کے تحت چین نے چار ارب ڈالر سے زائد قرضہ دینے کا وعدہ کیا جبکہ چین نے ہنبنتوتا پورٹ، کئی ہوائی اڈے اور شاہراہیں پہلے ہی تعمیر کی ہیں۔

سری لنکا کے صحافی انجنا سرور دھن کہتے ہیں کہ 'بھارت نے سری لنکا کے داخلی امور میں ہمیشہ مداخلت کی۔ وہ چاہے تامل باغیوں کی مدد کرنا تھا یا انتخابات میں بھارت نوازوں کو جتوانا تھا مگر چین نے ہمارے ملک کی معیشت کو بحال کرنے میں کافی مدد کی اور اندرونی معاملات میں دخل اندازی سے اجتناب کیا'۔

مزے کی بات یہ ہے کہ ایک دوسرے کے ازلی دشمن بھارت اور پاکستان باہمی تعلقات کے حوالے سے خاموش ہیں اور ایک دوسرے کے لوگوں کو بچانے کے عمل پر سبقت لے رہے ہیں، ابھی حال ہی میں صومالی سرحد کے قریب بھارت کی بحریہ نے ایک درجن سے زائد پاکستانیوں کو صومالی قزاقوں سے چھڑایا جبکہ اس سے قبل پاکستان نے روس یوکرین جنگ کے دوران بھارت کے طلبہ کو وہاں سے نکالنے میں مدد کی تھی۔

لائن آف کنٹرول پر گزشتہ تین برسوں سے جاری جنگ بندی قائم ہے اور سرحدوں پر کشیدگی کم ہو گئی ہے۔

بعض مرتبہ بلوچستان میں بعض بلوچوں کی باغیانہ حرکتوں کی ذمہ داری بھارت پر ڈالی جاتی ہے جو بقول پاکستان بلوچوں کی تحریک کو شہہ دے کر انہیں اسلحہ فراہم کر رہا ہے، جیسے ۱۹۷۱ء سے قبل بنگالیوں کو اسلحہ سے لیس کیا جا رہا تھا۔

بھارت کے حکمران بسا اوقات پاکستان کے زیر انتظام کشمیر کو ہتھیانے کا مطالبہ دہراتے ہیں لیکن بظاہر دونوں ملکوں نے اپنے اندرونی خلفشار پر توجہ مرکوز کر رکھی ہے۔ پھر چین اور پاکستان کے بیچ دوستی بھارت کے لیے کوئی نیک شگون نہیں ہے، جس کو توڑنے کے لیے روس کا سہارا لیا گیا تھا مگر وہ چین کو ایسی صلاح دینے کی پوزیشن میں نہیں ہے۔

گزشتہ سال دہلی میں جی۔۲۰ کے اجلاس کے بعد جو تاثر قائم کیا جا رہا تھا کہ بھارت کی کامیاب خارجہ پالیسی کی وجہ سے وہ دنیا بالخصوص جنوبی ایشیا کا محور بن گیا ہے۔

جب سے بعض سکھ رہنماؤں کو دوسرے ملکوں میں قتل کرنے کے الزامات عائد کیے گئے یا یوکرین پر بھارت کی پوزیشن یا چین کے اثر و رسوخ کے خلاف اقدامات کرنے پر شبہات پیدا ہوئے ہیں، اس کے بعد یہ تاثر درست ثابت نہیں ہو رہا ہے۔

بھارت میں اپوزیشن کے بیشتر رہنما کہتے ہیں کہ لداخ میں چین کے دو ہزار کلومیٹر سے زائد رقبے پر قبضہ اور بھوٹان میں ڈوکلام کے قریب چین کی گرفت کے دو سال بعد بھی اب تک وزیر اعظم مودی نے خاموشی اختیار کر رکھی ہے۔

بی جے پی کے مطابق بھارت کی آزاد خارجہ پالیسی نہ صرف دنیا میں باعثِ وقار بن رہی ہے بلکہ اس کی معیشت دنیا کی پانچویں بڑی معیشت بن چکی ہے۔ ملک میں پہلی بار بوئنگ یا ایپل اور دفاعی ساز و سامان سمیت بڑی کمپنیاں کارخانے قائم کرتی جا رہی ہیں۔ مودی کی حکومت نے چند برسوں میں پانچ ٹریلین معیشت بنانے کا وعدہ کیا ہے جو اس وقت تین ٹریلین سے تجاوز کر چکی ہے۔

لیکن دوسری جانب بعض تھنک ٹینکس کا خیال ہے کہ چین کی بڑھتی ہوئی تجارت، تعمیراتی منصوبے اور شاہراہوں کو جوڑنے سے جنوبی ایشیا کے بیشتر ممالک چین کی جھولی میں خود بخود گرتے جا رہے ہیں۔ بھارت کی جمہوریت پر سوالات اٹھ رہے ہیں اور بی جے پی کے بعض لیڈروں کی جانب سے انڈونیشیا سے لے کر قندھار تک ہندو راشٹر بنانے کی خواہش کو یہ ملک تشویش کی نظر سے دیکھ رہے ہیں۔

ان ملکوں میں چین کا اثر صرف سرمایہ کاری سے کم کیا جا سکتا ہے جو فی الحال بھارت کے بس کی بات نہیں ہے۔

(بحوالہ: ''انڈی پنڈنٹ اردو ڈاٹ کام''۔ ۲ فروری ۲۰۲۴ء)

بلوچستان میں اتنا تشدّد کیوں ہے؟

پاکستان میں دہشت گردی کے حوالے سے ایک تجزیے میں برطانوی جریدے 'دی اکنامسٹ' نے لکھا ہے کہ پاکستان کے صوبہ بلوچستان میں سرگرم دہشت گرد گروپ پاکستان اور ایران، دونوں ہی کے لیے دردسر ہیں۔ تجزیے کے مطابق عسکریت پسندی سے مؤثر طور پر نپٹنے کے لیے پاکستان اور ایران کو جامع مذاکرات کرنا ہوں گے تاکہ غلط فہمیاں دور ہوں اور حقیقی اعتماد بحال ہو۔

ایران اور پاکستان کے تعلقات تاریخ کے تناظر میں خوش گوار رہے ہیں۔ ۱۹۴۷ء میں پاکستان کو تسلیم کرنے والا پہلا ملک ایران ہی تھا۔ تجارت اور دفاع کے معاملات میں دونوں ممالک بہت حد تک مل جل کر کام کرتے ہیں۔

پاک ایران سرحدی علاقوں میں بلوچ عسکریت پسند گروپوں کی کارروائیاں دونوں حکومتوں کے لیے شدید پریشانی کا باعث ہیں۔ متعدد گروپ مل کر کام کرتے ہیں۔ حال ہی میں معاملات زیادہ سنگین ہوگئے ہیں۔ ۱۶؍جنوری کو ایران نے مغربی پاکستان میں میزائل داغے۔ اس کا کہنا تھا کہ سنی عسکریت پسند گروپ جیش العدل کے جنگجوؤں کو نشانہ بنا رہا ہے، جو اس کی نظر میں دہشت گرد ہیں۔ اس کے بعد پاکستان نے مشرقی ایران میں میزائل داغے۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ ایرانی سرزمین پر دہشت گردوں کے ٹھکانوں کو نشانہ بنا رہا ہے۔

ان کارروائیوں کے بعد دونوں ممالک نے اپنے اپنے سفیر کو واپس بلایا۔ معاملات اچانک بگڑتے دکھائی دینے لگے مگر پھر دونوں ممالک نے معاملات کو سفارت کاری کی سطح پر سلجھانے کا ڈول ڈالا۔ ۲۹ جنوری کو اسلام آباد میں ایران اور پاکستان کے وزرائے خارجہ نے ملاقات کی اور اس عزم کا اظہار کیا کہ دونوں ممالک اپنی اپنی سرزمین پر عسکریت پسند گروپوں کے خلاف لڑیں گے۔

پاک ایران سرحدی علاقوں میں خصوصی طور پر اور بلوچستان میں عمومی طور پر دہشت گردی جاری ہے۔

بلوچستان کو یہ نام بلوچ قبائل کی نسبت سے دیا گیا ہے۔ کسی زمانے میں بلوچ نسل کے لوگ خالص قبائلی زندگی بسر کرتے تھے۔ بعض مورخین کہتے ہیں کہ بلوچ قبائل نے پاکستان اور جدید ایران کے حصوں میں ۱۲۰۰؍سال قبل مسیح میں آباد ہونا شروع کیا۔ بلوچستان چونکہ جنوبی ایشیا کے لیے گیٹ وے کی سی حیثیت رکھتا ہے، اس لیے اس پر بیرونی قوتیں ہر دور میں حملہ آور ہوتی رہی ہیں۔ مکران کا ساحل بیرونی تاجروں اور حملہ آوروں کا مشاہدہ کرتا رہا ہے۔

بلوچستان اس اعتبار سے غیر معمولی علاقہ ہے کہ یہاں بیرونی لوگ ہمیشہ آباد ہوتے آئے ہیں۔ جب عربوں نے اس خطے میں قدم رکھا تو یہاں کے لوگ مشرف بہ اسلام ہوئے۔ عربوں کی آمد سے اس خطے کی تجارتی اور دفاعی اہمیت بڑھ گئی۔

انیسویں اور بیسویں صدی میں برطانیہ اور ایران نے بلوچستان کو آپس میں بانٹ لیا۔ اس کا کچھ حصہ افغانستان کو بھی دے دیا گیا۔ ایران نے مغربی بلوچستان کو ۱۹۲۸ء میں اپنا باضابطہ حصہ بنالیا۔ ۱۹۴۷ء میں برطانوی راج ختم ہوا، پاکستان قائم ہوا تو مشرقی بلوچستان پاکستان کا حصہ بن گیا۔

ایک پورے کے پورے خطے کی یوں بندر بانٹ کے جو خطرناک نتائج برآمد ہوسکتے تھے، وہ ہوئے۔ بلوچ قوم پرستوں میں عمومی تصور یہ ہے کہ پنجاب کے لوگوں نے انہیں دیوار سے لگا کر غربت اور پسماندگی کے گڑھے میں دھکیل دیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ۱۹۴۷ء سے اب تک وہ وفاقی حکومت کے خلاف لڑتے آئے ہیں۔ ۱۹۷۰ء کی دہائی میں بلوچستان کے حالات غیر معمولی خرابی سے دوچار ہوئے اور تشدد کے نتیجے میں کم و بیش ۸ ہزار افراد اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

۲۰۰۰ء کے عشرے میں بلوچستان میں ایک بار پھر غیر معمولی تشدد کی لہر اٹھی جو کسی نہ کسی شکل میں اب تک جاری ہے۔ بلوچستان کے طول و عرض میں موجود عسکریت پسندوں نے فورسز اور عام شہریوں پر حملوں میں جدید ترین ہتھیار استعمال کرنا شروع کردیے ہیں۔ اس کے نتیجے میں تشدّد بھی بڑھا ہے اور ہلاکتیں بھی۔ ۲۰۲۲ء میں کالعدم بلوچستان لبریشن آرمی نے صوبے کے کم از کم ۶ شہروں میں منصوبہ بندی کے ساتھ دھماکے کیے جس کے نتیجے میں فورسز کو غیر معمولی جانی نقصان برداشت کرنا پڑا۔

جب پاکستانی فورسز جوابی کارروائیاں کرتی ہیں تو صوبے کے حالات پر اس کا گہرا اثر مرتب ہوتا ہے۔ فورسز کی جوابی کارروائیوں پر انسانی حقوق کے علم بردار گروپ شور مچاتے ہیں کہ بے قصور لوگ مارے جارہے ہیں۔ یہ گروپ پاکستانی حکومت پر بلوچ رہنماؤں کو بلاجواز اور غیر قانونی طور پر زیرِ حراست رکھنے کا الزام بھی عائد کرتے رہے ہیں۔ پاکستانی فورسز کی کارروائیوں سے بچنے کے لیے بہت سے بلوچ عسکریت پسند افغانستان چلے گئے ہیں اور وہاں سے حملے کرتے ہیں۔

ایران میں آباد بلوچوں کی بھی شکایات ہیں۔ ان میں سے بہت سے انتہائی برے حالات میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ سیستان بلوچستان کو ایران میں غریب ترین علاقہ تصور کیا جاتا ہے۔ ایران کی حکومت پر بھی فرقہ وارانہ اقلیتوں کی حق تلفی کا الزام عائد کیا جاتا ہے۔ ان میں واضح اکثریت سنی بلوچوں کی ہے۔ ایران میں بلوچ عسکریت پسندوں نے ۲۰۰۰ء کی دہائی کے اوائل میں قدم مضبوطی سے جمائے۔

۲۰۰۵ء میں جنداللہ نے منظر عام پر آکر ایرانی حکام کو نشانہ بنانا شروع کیا۔ یہ عسکریت پسند گروپ ایرانی حکام کو یرغمال بنانے کے بعد ان میں سے بہت سوں کو قتل کردیتا تھا۔ ۲۰۰۶ء میں اس گروپ نے ۲۰ سے زائد ایرانیوں کو قتل کیا۔ جیش العدل، جس کے بارے میں ایرانی حکومت کہتی ہے کہ یہ پاکستانی سرزمین پر قائم ہے، جنداللہ سے الگ ہونے والا دھڑا تصور کیا جاتا ہے۔ حالیہ چند ماہ کے دوران اس گروپ نے ایرانی سرزمین پر بعض بڑے حملے کیے ہیں۔ دسمبر ۲۰۲۳ء میں ایک بڑے حملے میں ۱۱؍ایرانی پولیس افسر جاں بحق ہوئے تھے۔

بلوچستان میں شدید عدم استحکام سے ایران اور پاکستان کے لیے اپنے قدرتی وسائل سے کما حقہ مستفید ہونا ممکن نہیں ہو پا رہا۔ دونوں ملکوں کے قدرتی وسائل میں قدرتی گیس، تیل، تانبا اور سونا نمایاں ہیں۔ عسکریت پسند گیس کے بنیادی ڈھانچے پر بھی حملے کرتے رہے ہیں۔ دونوں ملکوں کے درمیان ایک بڑی گیس پائپ لائن بھی عسکریت پسندی کے باعث مکمل نہیں ہو پا رہی۔ عسکریت پسند گروپ گوادر میں چین کی فنڈنگ سے ایک بڑی بندرگاہ کی تعمیر کے بھی مخالف رہے ہیں۔ یہ بندرگاہ ایران کے بہت نزدیک ہے۔ عسکریت پسند گروپوں نے گوادر کی بندرگاہ سے متعلق منصوبوں پر کام کرنے والے چینی افسران اور محنت کشوں پر بھی حملے کیے ہیں۔ اس کے نتیجے میں پاکستانی حکومت کو بلوچستان میں بڑے پیمانے پر فورسز تعینات کرنا پڑی ہیں۔

۲۹ جنوری کو ملاقات اور مذاکرات کے بعد پاکستان اور ایران کے وزرائے خارجہ نے اس عزم کا اعادہ کیا کہ معاملات کو بگڑنے نہیں دیا جائے گا۔ ایرانی وزیر خارجہ نے کہا کہ دونوں حکومتیں دہشت گردوں کو مشترکہ سلامتی کے لیے خطرات پیدا کرنے کی اجازت نہیں دیں گی۔

بہرکیف، محض وعدوں اور یقین دہانیوں سے بلوچوں کی شکایات کا ازالہ نہ ہوگا۔

(ترجمہ: ابوصباحت)

"Why is there so much violence in Balochistan?" ("The Economist". Feb 2, 2024)

پرنٹ میڈیا کو اپنا مزاج بدلنا ہوگا!

ابو صباحت

ٹیکنالوجی میں پیش رفت عجیب ہی گل کھلاتی جارہی ہے۔ ہر شعبے میں انقلابی تبدیلیاں رونما ہورہی ہیں اور بعض شعبے تیزی سے معدومیت کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ جن شعبوں میں خود کو وقت کے ساتھ بدلنے کا شعور عام نہیں، وہ بہت تیزی سے خاتمے کی طرف جارہے ہیں۔

میڈیا میں بھی انتہائی نوعیت کی تبدیلیاں رونما ہورہی ہیں، جس سے میڈیا کا صرف مزاج ہی نہیں بدل رہا بلکہ مجموعی طور پر پوری ساکھ ہی داؤ پر لگی ہوئی ہے۔ پرنٹ میڈیا کا بھی کچھ ایسا ہی معاملہ ہے۔ دنیا بھر میں پرنٹ میڈیا کو شدید مشکلات کا سامنا ہے اور یہ اس لیے ہیں کہ پرنٹ میڈیا کے لیے تیزی کے معاملے میں دیگر میڈیا کا ساتھ دینا ممکن ہی نہیں۔

دنیا بھر کے میڈیا سے متعلق امور پر نظر رکھنے والے ماہرین کہتے ہیں کہ الیکٹرانک اور ڈیجیٹل میڈیا کو تیزی مبارک رہے، اخبارات و جرائد کو پختہ مواد پیش کرنا ہوگا۔ پرنٹ میڈیا یعنی اخبارات و جرائد اور کتب کو سنگین بحران کا سامنا ہے۔ پرنٹ میڈیا میں لوگوں کی دلچسپی بہت تیزی سے گھٹ رہی ہے، جس کا بنیادی سبب یہ بھی ہے کہ پرنٹ میڈیا سے وابستہ لوگوں نے اپنا مائنڈ سیٹ تبدیل نہیں کیا ہے۔ وہ آج بھی پانچ سے سات عشروں پہلے کی ذہنیت کے ساتھ جی رہے ہیں۔

پرنٹ میڈیا سے شغف رکھنے اور اس سے محبت کرنے والوں کی تعداد میں تیزی سے کمی واقع ہوتی جارہی ہے۔ دوسری طرف یہ امر بھی انتہائی حیرت انگیز ہے کہ ترقی یافتہ ممالک میں اب بھی ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو پرنٹ میڈیا پر زیادہ بھروسا رکھتے ہیں۔

میڈیا کی دنیا میں رونما ہونے والی حیرت انگیز اور مایوس کن تبدیلیوں پر نظر رکھنے والے ماہرین کہتے ہیں کہ پرنٹ میڈیا کا کمزور پڑنا کسی بھی درجے میں غیر متوقع نہیں۔ معاملہ یہ ہے کہ ٹیکنالوجی کی پیش رفت نے دوسرے بہت سے شعبوں کی طرح میڈیا کے متعلقین کو بھی مجبور کردیا ہے کہ کچھ نیا سوچیں اور کچھ ایسا کریں جس سے تیزی کا متبادل پیش کرنے کے بارے میں سوچا جاسکے۔

ٹیکنالوجی میں پیش رفت نے الیکٹرانک اور آن لائن میڈیا کو غیر معمولی مقبولیت سے ہم کنار کیا ہے۔ یہ ہونا ہی تھا کیونکہ الیکٹرانک اور ڈیجیٹل میڈیا نے خبریں بہت تیزی سے لوگوں تک پہنچانا بہت حد تک ممکن بنادیا ہے۔

ایک بنیادی سوال یہ ہے کہ پرنٹ میڈیا کو الیکٹرانک اور ڈیجیٹل میڈیا کے سامنے کیوں لایا جارہا ہے۔ پرنٹ میڈیا کا جو بھی کردار تھا، وہ اب تبدیل ہوچکا ہے۔ تیزی کے معاملے میں اخبارات و جرائد کسی بھی درجے میں الیکٹرانک اور ڈیجیٹل میڈیا کا مقابلہ نہیں کرسکتے۔ ٹی وی چینل، یوٹیوب چینل، ویب ٹی وی، ویب سائٹس اور ایسے ہی دیگر آن لائن میڈیا کے ذریعے لوگوں کو بہت کچھ بہت تیزی سے میسر ہے۔ ایسے میں یہ سوچا بھی نہیں جاسکتا کہ اخبارات و جرائد ان سے مقابلہ کرسکتے ہیں۔

ماہرین کہتے ہیں کہ پرنٹ میڈیا کو زندہ رہنے کے لیے جو کچھ کرنا ہے اس میں اولین ترجیح مزاج کی تبدیلی کو دی جانی چاہیے۔ دنیا بھر میں پرنٹ میڈیا کو زندہ رکھنے کے لیے اُس کا مزاج بہت حد تک تبدیل کیا جاچکا ہے۔ جب ہم پرنٹ میڈیا کو درپیش چیلنجز کی بات کرتے ہیں تو اکثر یہ بھول جاتے ہیں یہ چیلنج کسی بھی درجے میں حیرت انگیز ہیں نہ تباہ کن۔ ہر چیلنج انسان کو کچھ نہ کچھ کرنے کی تحریک ہی دیتا ہے۔ پرنٹ میڈیا کو درپیش ہر چیلنج کا بھی یہی معاملہ ہے۔ اگر ہم ہوش مندی کا مظاہرہ کریں تو اندازہ لگاسکتے ہیں کہ جدید دور کے چیلنج نہ ہوتے تو پیش رفت کی گنجائش بھی پیدا نہ ہوتی۔

ٹی وی، ویب سائٹس اور سوشل میڈیا کے ذریعے بہت سا مواد تیزی سے تو پھیلایا جاسکتا ہے تاہم وہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے کچا ہوتا ہے۔ کسی بھی موضوع پر پختہ تر مواد صرف پرنٹ میڈیا کے ذریعے پیش کیا جاسکتا ہے کیونکہ وہاں وقت کی گنجائش رہتی ہے۔ دنیا بھر میں اخبارات و جرائد کا مزاج تجزیاتی ہوتا جارہا ہے۔ مغربی دنیا نے اس معاملے میں اپنے آپ کو بہت تیزی سے تبدیل کیا ہے۔ اب وہاں خبر سے زیادہ اُس سے جڑے ہوئے معاملات کو ڈھنگ سے پیش کرنے کو ترجیح دی جاتی ہے۔

ٹی وی چینل اور ویب سائٹس کی سی تیزی کا مقابلہ نہ کرپانے کی صورت میں خود کو مسابقت کی دوڑ میں رکھنے کے لیے پرنٹ میڈیا کے پاس اب مواد کی پختگی ہی کا طریق رہ گیا ہے۔ اس راستے پر چل کر وہ خود کو اچھی طرح زندہ رکھ سکتے ہیں۔ اس کے لیے متعلقہ عملے کو اضافی تربیت دینے کی ضرورت ہے۔ بعض صورتوں میں تو لازم ہوچکا ہے کہ نیا عملہ رکھا جائے اور وہ بھی غیر معمولی تربیت یافتہ۔

عام آدمی کے ذہن میں اب بھی یہ تصور پایا جاتا ہے کہ ٹی وی چینل اور ویب سائٹس وغیرہ کچا مواد پیش کرتی ہیں۔ ایسے میں جب وہ مزاج کے اعتبار سے پختہ تر مواد پیش کرنے سے قاصر رہتی ہیں تب لوگ اخبارات و جرائد کی ویب سائٹس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ اگر وہاں بھی پختہ، معیاری مواد میسر نہ ہو تو کوئی کیوں اُن سے مستفید ہوگا اور انہیں خریدنے کے بارے میں سوچے گا؟

مغربی دنیا میں اخبارات و جرائد نے خود کو مضبوط تر بنانے پر بہت محنت کی ہے۔ بہت سے مغربی اخبارات و جرائد اپنے مواد کے مستند ہونے کی بنیاد پر آج بھی دنیا بھر میں غیر معمولی مقبولیت سے ہم کنار ہیں۔ امریکا اور برطانیہ کے بہت سے اخبارات و جرائد آج بھی طویل مضامین شائع کرتے ہیں اور اُنہیں پڑھا بھی جاتا ہے۔ اگر کوئی رپورٹ خاصی تحقیق کے بعد تیار کی جائے اور اُس میں متعلقہ اعداد و شمار بھی قطعیت کے ساتھ دیے گئے ہوں تو لوگ متوجہ ہوتے ہیں اور دلچسپی سے پڑھتے ہیں۔

ماہرین کہتے ہیں کہ ترقی پذیر اور پسماندہ ممالک میں اخبارات و جرائد کو اپنا مزاج بدلنا ہوگا۔ انہیں تیزی اپنانے کے بجائے ٹھہراؤ پر متوجہ ہونا ہوگا۔ ٹھہراؤ کا مطلب یہ نہیں کہ صرف سُست روی اختیار کی جائے بلکہ اِس سے مراد لوگوں کو ایسا مواد فراہم کرنا ہے جس میں پختگی ہو، قطعیت ہو، وابستگی کا احساس ہو اور قارئین محسوس کریں کہ وہ ایسا مواد پڑھ رہے ہیں جس کا ان کی دلچسپی سے کوئی گہرا تعلق ہے۔ ٹی وی چینلز اور ویب سائٹس جو کچھ بہت تیزی سے پیش کرتے ہیں، اُسے جمع کرکے اُس کا تجزیہ کرکے بھرپور سنجیدگی کے ساتھ تیار کیا جانے والا تجزیہ قارئین کو اپنی طرف زیادہ تیزی سے متوجہ کرسکتا ہے۔

پرنٹ میڈیا کے مجموعی مزاج کو بدلے بغیر اِسے ڈھنگ سے زندہ رکھنا ممکن نہ ہوسکے گا۔ ترقی یافتہ دنیا کے اخبارات و جرائد کو دیکھیے تو اندازہ ہوتا ہے کہ وہ خبروں پر کم اور تجزیوں پر زیادہ توجہ دیتے ہیں۔ وہاں اب اخبارات و جرائد کا مجموعی مزاج ہی ایسا ہوگیا ہے کہ کسی بھی پریس کانفرنس کی کوریج میں پس منظر اور ممکنہ ردِعمل شامل ہوتا ہے۔ کسی بھی چیز کو پڑھنے کے قابل بنانے کے لیے ناگزیر ہے کہ اُس میں بہت سے حوالے اور اقتباسات بھی شامل ہوں۔ کسی بھی خبر کو چند خبروں، انٹرویوز وغیرہ کے اقتباسات سے مزین کرنے کی صورت میں لوگ متوجہ ہوتے ہی ہیں۔

معاشی پیش گوئیاں غلط کیوں ثابت ہو رہی ہیں؟

دنیا بھر کی معیشتیں شدید بحرانی کیفیت سے دوچار ہیں۔ وہ زمانے ہوا ہوئے جب کوئی معاشی بحران آتا تھا اور اس سے نمٹنے کے اقدامات کیے جاتے تھے۔ اب معیشتوں کے لیے بحرانی کیفیت برقرار رہتی ہے اور حکومتیں اس حوالے سے اقدامات میں مصروف رہتی ہیں۔ ٹیکنالوجی میں پیش رفت نے معاملات کو اتنا الجھا دیا ہے کہ اب کوئی بھی معیشت اپنے آپ کو بدلتے رہنے کے معاملے میں لاپروائی کی متحمل نہیں ہوسکتی۔

معاشی امور کے ماہرین معیشتوں کی کیفیت اور ممکنہ تبدیلیوں کے حوالے سے پیش گوئیاں کرتے رہتے ہیں۔ بیشتر پیش گوئیاں اب غلط ثابت ہو رہی ہیں۔ اس حوالے سے ان پر تنقید بھی کی جارہی ہے۔ کیا ماہرینِ معاشیات ٹھوس حقائق اور مستند اعداد و شمار کی بنیاد پر کوئی پیش گوئی کرتے ہیں یا پھر یونہی ہوائیاں اڑاتے پھرتے ہیں؟ اس حوالے سے مختلف آرا پائی جاتی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ بیشتر معاشی ماہرین ٹھوس حقائق اور حالات کی بنیاد ہی پر کوئی پیش گوئی کرتے ہیں مگر جب حالات بدلتے ہیں تو اُن کی پیش گوئی بہت حد تک غلط ثابت ہو جاتی ہے۔ معاشی امور کے تجزیہ کار بھی جو کچھ کہتے ہیں، وہ اعداد و شمار اور دکھائی دینے والے اقدامات کی بنیاد ہی پر ہوتا ہے۔ بڑی معیشتیں جب انقلابی نوعیت کے یا غیر معمولی اقدامات کرتی ہیں تب بہت کچھ بدل جاتا ہے اور دنیا بھر کی معیشتوں کے حوالے سے کہی جانے والی باتیں غلط بھی ثابت ہونے لگتی ہیں۔

اس وقت بھی دنیا بھر میں معاشی اور معیشتی امور کے ماہرین کو اپنی پیش گوئیوں کے غلط ثابت ہونے پر تنقید کا سامنا ہے۔ افراطِ زر کی شرح، گلوبل سپلائی چین میں خلل واقع ہونے اور کساد بازاری سے متعلق پیش گوئیاں غلط ثابت ہو رہی ہیں۔ ماہرین نے معیشتی امور میں جن خرابیوں کا اندیشہ ظاہر کیا تھا، وہ تو واقع نہیں ہوئیں اور بہتری ضروری دکھائی دی ہے۔

کورونا کی وبا کے ختم ہونے کے بعد روس اور یوکرین کی جنگ اور اب غزہ کی صورتحال کے باعث مشرقِ وسطیٰ میں رونما ہونے والی سیاسی و معاشی خرابیوں نے معاشی امور کے ماہرین کے لیے نمایاں قطعیت کے ساتھ پیش گوئیاں کرنا انتہائی مشکل بنا دیا ہے۔

گزشتہ ماہ سوئٹزرلینڈ کے شہر ڈیووس میں ماہرینِ معیشت پر تنقید کرنے والوں میں یورپی سینٹرل بینک کی صدر کرسٹین لاگارڈے بھی شامل ہوگئیں۔ ان کا کہنا تھا کہ بیشتر معاشی ماہرین قبائلی دور کی ذہنیت کے ساتھ جی رہے ہیں۔ وہ اب بھی بہت تنگ پیرایوں میں رہتے ہوئے سوچتے ہیں۔

کرسٹین لاگارڈے کا یہ بھی کہنا تھا کہ ماہرینِ معیشت اپنی تحقیق اور غور و فکر کے ذریعے ٹھوس رائے قائم کرنے کے بجائے ایک دوسرے کی باتیں چرا کر قیاس آرائیاں کرتے ہیں۔ کرسٹین لاگارڈے فرانس کی وزیر خزانہ اور بین الاقوامی مالیاتی فنڈ کی سربراہ رہ چکی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ماہرینِ معیشت اپنے کمفرٹ زون سے باہر نہیں نکلتے۔ وہ لگی بندھی اور نپی تُلی رائے دیتے ہیں اور اس میں بالعموم کوئی بنیادی تبدیلی نہیں کرتے۔

آئی این جی بینک میں چیف یوروزون اکنامسٹ پیٹر وینڈن ہاؤٹے کا کہنا ہے کہ ماہرینِ معیشت لگی بندھی سوچ کے حامل ہیں۔ وہ ایک خاص حد تک جاتے ہیں اور پھر واپس آجاتے ہیں۔ وہ اس حقیقت کو تسلیم کرنے سے گریز کرتے ہیں کہ دنیا بہت بدل چکی ہے۔

کرسٹین لاگارڈے اور امریکی مرکزی بینک فیڈرل ریزرو کے چیئرمین جیروم پاول کی پیش گوئی تھی کہ کورونا کی وبا کے بعد بحالی کے مرحلے میں اور پھر یوکرین پر روسی لشکر کشی کے باعث دنیا بھر میں افراطِ زر کی شرح بڑھے گی تاہم یہ عبوری مدت کے لیے ہوگا۔ رفتہ رفتہ افراطِ زر کی شرح کم ہو جائے گی مگر ان کی بات غلط ثابت ہوئی۔

دنیا بھر میں مرکزی بینکوں کو بڑھتی ہوئی قیمتوں کا مقابلہ کرنے کے لیے سود کی شرح بڑھانا پڑے گی۔ چند ماہ کے دوران قیمتیں ٹھنڈی پڑ چکی ہیں۔ پالیسی سازوں نے شرحِ سود کو بلند رکھا ہے کیونکہ وہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ رواں سال شرحِ سود میں کٹوتی کی گنجائش ہے بھی یا نہیں۔

کرسٹین لاگارڈے کہتی ہیں کہ معاشی معاملات میں پیش گوئی کرتے وقت بہت سے اہم عوامل کو ذہن نشین نہیں رکھا گیا۔ پیٹر ویندن ہاؤٹے کا کہنا ہے کہ معیشتی امور کے ماہرین کوئی بھی پیش گوئی کرتے وقت جو ماڈل ذہن نشین رکھتے ہیں، وہ زیادہ قابلِ اعتماد نہیں اور دوسرے بہت سے عوامل ایسے ہیں جنہیں سمجھنا اور آپس میں جوڑ کر دیکھنا دشوار ہے۔ انہوں نے کورونا کی وبا کے دوران بعض سپلائی چین میں رونما ہونے والے خلل، افرادی قوت کی کمی اور سیاسی و سفارتی کشیدگی کا خاص طور پر حوالہ دیا۔

ایلیانز ٹریڈ سے وابستہ ماہرِ معاشیات میگزم ڈرمیٹ کہتے ہیں کہ معاشی ماڈل ناکامی سے دوچار نہیں ہوئے۔ حقیقت یہ ہے کہ ماہرینِ معاشیات کے تصورات ناکافی اور ناکام رہے ہیں۔ وہ اپنی خیالی دنیا میں رہتے ہیں۔ ان کے ذہن میں یہ تصور بسا رہتا ہے کہ جو دنیا اُن کے ذہن میں پائی جاتی ہے اُس میں کچھ بھی غلط نہیں ہو رہا۔

مرکزی بینکوں نے معیشتوں کو بہت زیادہ گرم ہونے سے روکنے کے لیے سود کی شرح بلند کرنے کا حربہ استعمال کیا۔ اس پر ماہرینِ معیشت نے خبردار کیا کہ ترقی یافتہ دنیا میں ترقی کی شرح تیزی سے گرے گی اور ۲۰۲۳ء میں سکڑاؤ بھی پیدا ہوسکتا ہے۔

۲۰۲۳ء کے دوران، ماہرینِ معاشیات کی پیش گوئیوں کے برعکس، امریکا میں شرحِ نمو بلند ہوئی اور معیشتی بحالی کا عمل بہت حد تک خوش گوار رہا۔ دوسری طرف جرمنی کے سوا یورو زون میں مجموعی طور پر معاشی نمو کی رفتار خاصی سست رہی۔ پرنسٹن یونیورسٹی میں معاشیات کے پروفیسر ایلین بلنڈر کہتے ہیں کہ افراطِ زر کی شرح کا بلند نہ ہونا بجائے خود ایک معمہ ہے۔

امریکا میں جو کچھ ہو رہا تھا، اس کے نتیجے میں کساد بازاری کی پیش گوئی کے سوا چارہ نہ تھا۔ تمام اشاریے انتہائی مایوس کن تھے۔ ایک بار پھر ماہرینِ معاشیات پر انتہائی تنگ نظر ہونے کا الزام عائد کیا گیا۔ پیٹر وینڈن ہاؤٹے کہتے ہیں کہ ماہرینِ معاشیات کے ناکام ہونے کی بنیادی وجوہ میں کمزور معیار کا ڈیٹا اور رائے عامہ کے جائزوں کے ریسپانس کی گرتی ہوئی شرح بھی نمایاں تھی۔

مارکیٹ سکیورٹیز موناکو سام کے ڈائریکٹر جنرل کرسٹوفر بیراڈ کہتے ہیں کہ اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا گیا ہے کہ بیشتر معاملات میں صَرف کو بڑھانے میں بچتوں نے کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ معاشیات میں نوبیل انعام حاصل کرنے والے ایستھر ڈفلو نے اے ایف پی کو ایک حالیہ انٹرویو میں بتایا کہ جن پروفیشنلز پر بھروسا کیا جاتا ہے، ان میں ماہرینِ معاشیات سب سے آخر میں کھڑے ہیں۔ ان سے زیادہ تو لوگوں کو موسم کی پیش گوئی کرنے والوں پر بھروسا ہے۔ اب چند ماہرینِ معاشیات نے اپنے آپ کو بدلنا شروع کیا ہے۔

افراطِ زر کی شرح کے بلند ہونے کا اندازہ لگانے میں غلطی پر تنقید کا سامنا کرنے کے بعد جولائی ۲۰۲۳ء میں بینک آف انگلینڈ نے امریکی مرکزی بینک فیڈرل ریزرو کے سابق چیئرمین بین برنینکے کی خدمات حاصل کیں تاکہ پیش گوئی کے عمل میں پائی جانے والی خامیاں دور کی جاسکیں۔

اپنی اصلاح پر مائل ہو کر بینک آف کینیڈا نے بھی معاشی

>>> باقی صفحہ نمبر ۶ <<<

کیا مغرب کو تیسری عالمی جنگ کا خدشہ ہے؟

شان اوگریڈی

چیف آف جنرل اسٹاف اور آرمی چیف جنرل سر پیٹرک سینڈرز نے اپنے اختتامی خطاب میں برطانیہ کی موجودہ آبادی کو 'جنگ سے پہلے کی نسل' قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ اب 'ہمارے معاشروں کو جنگی بنیادوں پر کھڑا کرنے کے قابل بنانے کے لیے تیاری کے اقدامات' کرنے کی ضرورت ہے۔

ولادی میر پوتن کے روس کے خلاف 'قومی تحریک' ایسے الفاظ ہیں، جس کا چند سال پہلے تک تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا، لیکن یوکرین پر مکمل حملے اور کریملن کی جانب سے مسلسل جارحانہ مؤقف نے اچانک ان تصورات کو مرکزی دھارے میں شامل کر دیا ہے۔

'جنگ سے پہلے کی نسل' سے کیا مراد ہے؟

دیوار برلن گرنے، سرد جنگ کے خاتمے اور ۱۹۹۰ء کے لگ بھگ سوویت یونین کے ٹوٹنے کے بعد تقریباً دو دہائیوں تک، مغرب سوویت یونین کے ساتھ جنگ کے درمیانی مدت کے خطرے کے بارے میں فکرمند ہونے سے بچنے میں کامیاب رہا کیونکہ اس کا وجود ہی نہ رہا تھا۔

مغربی حکومتوں نے جلد ہی 'امن کے ثمرات' کا فائدہ اٹھایا، اپنے آپ کو جزوی طور پر غیر مسلح کر دیا اور دفاعی اخراجات کو نجی ضروریات پوری کرنے اور عوامی خدمات کی طرف موڑ دیا۔

اب مفروضہ یہ ہے کہ روس اور دیگر طاقتوں کے ساتھ جنگ زیادہ دور کی بات نہیں ہے۔ جیسا کہ وزیر دفاع گرانٹ شیپس نے حال ہی میں کہا تھا: 'پانچ برس میں ہم مختلف جغرافیائی سیاسی تنازعات یا فوجی کشیدگی کا سامنا کر سکتے ہیں جن میں روس، چین، ایران اور شمالی کوریا شامل ہوں گے۔ اپنے آپ سے پوچھیں، آج کے تنازعات کو دیکھتے ہوئے کیا لگتا ہے کہ یہ تعداد بڑھے گی یا کم ہوگی؟ مجھے شک ہے کہ ہم سب اس کا جواب جانتے ہیں، اس میں اضافے کا امکان ہے، لہٰذا ۲۰۲۴ء ایک اہم موڑ ہونا چاہیے'۔

جنرل سینڈرز کیا چاہتے ہیں؟

جنرل سینڈرز کے خیال میں 'قوم کو متحرک' کرنے کی بنیادیں روس کے ہمسایہ یا قریبی ممالک تک محدود نہیں رہ سکتیں اور اس کے نتیجے میں برطانیہ میں عام لوگ کسی نہ کسی طرح برطانیہ کی ۷۴۱۱۰ رکل وقتی باقاعدہ فوج کو مضبوط کرنے پر مجبور ہوں گے تا کہ یورپ میں موجود خطرے سے بچا جا سکے۔

جنرل سینڈرز کے اپنے الفاظ میں ''ہم اس سے محفوظ نہیں رہیں گے اور جنگ سے پہلے کی نسل کی حیثیت سے ہمیں اسی طرح کی تیاری کرنی ہوگی۔ اور یہ ایک پوری قوم کا کام ہے۔ یوکرین نے دکھا دیا ہے کہ باقاعدہ فوجیں جنگیں شروع کرتی ہیں۔ شہری افواج انہیں جیتتی ہیں''۔

جیسا کہ وزارت دفاع نے فوری وضاحت کی، اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ لازمی بھرتی دوبارہ شروع ہو جائے گی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ نوجوان شہریوں سے جنگ کے حالات میں رضاکارانہ طور پر کام کرنے کی توقع کی جائے گی اور ہر ایک کو روس کی شکست تک 'مکمل جنگ' کی کوششوں میں معاونت کرنی ہوگی۔

کیا یہ صرف مخصوص درخواست ہے؟

صرف تبدیلی کے لیے، ایسا لگتا ہے کہ اس میں سے زیادہ کچھ نہیں ہے، لیکن ہر ملک میں ہر حاضر سروس چیف پیسے، سازوسامان اور وسائل کی کمی کی شکایت کرتا ہے۔

بحیرہ جنوبی چین سے لے کر افغانستان تک کم ہی ایسے مسائل والے مقامات موجود ہیں جہاں برطانیہ نے کوئی فوج نہیں بھیجی، اس کے باوجود قومی آمدنی کے تناسب کے لحاظ سے دفاعی اخراجات سکڑ گئے ہیں اور نپولین کی جنگوں کے بعد سے اب تک برطانوی فوج اپنی سب سے کم تعداد تک سکڑ گئی ہے۔

موجودہ حکومت نے افواج کے لیے مزید فنڈ فراہم کرنے کے مسلسل وعدے کیے ہیں، لیکن یہ قومی آمدنی کے دو فیصد سے زیادہ نہیں ہیں، جو سرد جنگ کے دوران اس کا دگنا تھا۔ یہ بجٹ طویل عرصے سے برطانوی صحت کے ادارے این ایچ ایس کے لیے وقف ہے اور یہ دیکھنا مشکل ہے کہ کسی اور جگہ سے کم کیے بغیر جمود کا شکار معیشت میں دفاعی اخراجات کو کس طرح بڑھایا جائے گا۔

برطانیہ کا جوہری ڈیٹرنس کہاں گیا؟

سپر پاورز کے پاس موجود ایٹمی ہتھیاروں کے وسیع ذخیرے نے بنیادی طور پر دوسری جگہوں پر پراکسی جنگوں کو نہیں روکا، نہ ہی انہوں نے حال ہی میں روس، ایران، چین اور شمالی کوریا کی جارحانہ سرگرمیوں پر قدغن لگائی ہے۔

یہ بالکل قابل فہم ہے کہ یوکرین اور غزہ میں جاری جنگوں میں سے کوئی بھی مزید پھیل سکتی ہے اور دوسری طاقتیں اس میں شریک ہو سکتی ہیں۔

اگرچہ یورپ میں روسی فوجیوں کے ساتھ امریکی، برطانوی، پولش، جرمن اور دیگر مغربی افواج کی براہ راست لڑائی کے متعلق سوچنا فی الحال مشکل لگتا ہے، لیکن اس سے انکار ممکن نہیں۔

اس طرح کی جنگ روایتی ہتھیاروں سے لڑی جا سکتی ہے اور ضروری نہیں کہ اس کا مطلب یہ ہو کہ ایک قیامت خیز ایٹمی جنگ برپا ہو۔ لیکن جوہری ہتھیاروں کی موجودگی کا مقصد سپر پاورز کے درمیان روایتی جنگوں کو روکنا تھا۔

اس بیان کی سیاست کیا ہے؟

اگر لیبر پارٹی اب بھی برطانوی لیبر پارٹی کے سابق رہنما جیریمی کوربن کے پیروکاروں کی گرفت میں ہوتی تو جنگ کے خطرات اور جوہری ہتھیاروں کی افادیت کے بارے میں ایک جاندار بحث ہوتی۔

موجودہ صورتحال میں، اگرچہ غزہ اور صدر پوتن کی جانب سے درپیش خطرات کے حوالے سے دونوں بینچوں (حکومت اور اپوزیشن) کے درمیان وسیع تر اتفاق رائے پایا جاتا ہے۔ فکر کی بات یہ ہے کہ کوئی بھی اہم پارٹی بڑے دفاعی بجٹ کے لیے تیار نظر نہیں آتی۔

کیا روس اور اس کے اتحادیوں کے ساتھ جنگ ہوگی؟

ایسا ہونا ناممکنات میں شامل نہیں ہے۔ مغرب۔ یورپ، شمالی امریکا، جاپان، جنوبی کوریا، آسٹریلیا وغیرہ۔۔۔ کے پاس بہتر ٹیکنالوجی اور بنیادی طور پر بڑی معیشتیں ہوں گی، لیکن روس اور چین دونوں کو اپنی زیادہ آبادی اور اپنی بڑی صنعتوں کے لحاظ سے بڑی سبقت حاصل ہے۔ یوکرین کے موجودہ تنازع کا سبق کم وبیش یہی ہے۔

باہمی طور پر یقینی تباہی اور لاکھوں جانوں کے ضیاع کے امکان کے علاوہ، تیسری عالمی جنگ عالمی معیشت کو تباہ کر دے گی اور کرۂ ارض کو ناقابل تلافی نقصان پہنچانے کے علاوہ غیر متوقع ماحولیاتی تبدیلی سے بچانے کی کسی بھی امید کو ختم کر دے گی، اس لیے جنرل سینڈرز کا فکرمند ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں۔

(بحوالہ: ''انڈی پنڈنٹ اردو ڈاٹ کام''۔ ۲۷ جنوری ۲۰۲۴ء)

کلونیل اِزم کی بنیادیں

ڈاکٹر مبارک علی

جب یورپی سامراج نے ایشیا اور افریقا میں اپنی نوآبادیاں قائم کیں تو وہ اپنے ساتھ ایک نیا سیاسی نظام، معیشت، تعلیم اور نئی علمی معلومات بھی ساتھ لے کر آئے۔ ان بنیادوں پر انہوں نے وہاں اپنے اقتدار کو مستحکم کیا۔

جب یورپی ملکوں نے ایشیا اور افریقا میں اپنی نوآبادیاں بنائیں تو اس عمل کی ابتدا فوجی فتوحات سے ہوئی۔ لیکن انہیں احساس تھا کہ محض فوجی طاقت کے ذریعے وہ زیادہ عرصے تک وہاں اقتدار میں نہیں رہ سکیں گے۔ ان کے خلاف بغاوتیں ہوں گی اور ان کی ساری توانائی ان بغاوتوں کو کچلنے میں ہی صرف ہو جائے گی۔ اس لیے انہوں نے دوسرا طریقہ یہ اختیار کیا کہ ان نوآبادیوں کے باشندوں کو اپنا وفادار بنانے کے لیے ثقافت اور علم کی طاقت کو استعمال کیا جائے۔

اس مقصد کے لیے ضروری تھا کہ محکوم قوموں کی روایات، اداروں اور تاریخ کو بدلا جائے تاکہ ان کی شناخت کی بنیادیں کمزور ہو جائیں۔ ان کا قومی تفاخر ختم ہو جائے اور وہ غیر ملکی اقتدار کو تسلیم کر لیں۔ یورپی نقطۂ نگاہ سے اس طرح کا کلونیل ازم اس لیے ضروری تھا کہ وہ محکوم قوموں کی تاریخ، ثقافت، وہاں بولی جانے والی زبانیں، معاشرے کی سماجی تقسیم، جاگیرداروں اور قبائلی سرداروں کے اثر و رسوخ کو جاننے کے لیے ان پر تحقیق کریں اور یہ پالیسی بنائیں کہ انہیں کس طرح غیر ملکی امداد کے لیے استعمال کیا جائے۔

یہاں ہم ہندوستان کی مثال دینا چاہتے ہیں۔ چونکہ اس کی کوئی تاریخ نہیں تھی، اس لیے اولین طور پر یہ تاریخ سیاسی اہلکاروں نے لکھی۔ تاریخ نویسی میں مزید اضافہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازمین نے کیا۔ اس لیے ہندوستان کی نئی تاریخ برطانوی حکومت سے ہوئی۔

ہندوستان کے معاشرے کو سمجھنے کے لیے ان کی عادات، روایات اور مختلف علاقوں کے جغرافیائی حالات اور آب و ہوا کے اثرات کے لیے نئے علوم سے مدد لی گئی۔ مثلاً ہندوستان کے مختلف نقشے تیار کیے گئے۔ مردم شماری کے ذریعے معاشرے کے مذہب اور ذات پات کے بارے میں معلومات اکٹھا کی گئیں۔ ہر صوبے کی تاریخ، جغرافیہ اور رسمیں، وہاں بسنے والے لوگوں میں طبقاتی فرق، گندم کی پیداوار، تجارت اور بازار کے بارے میں اور اشیاء کی قیمتوں کے تعین کے بارے میں معلومات، صوبے کے اہم شخصیات کا ذکر، جن میں پیر اور جاگیردار بھی شامل تھے، ہر طرح کی معلومات جمع کی گئیں۔ یہاں تک کہ صوبے میں بولی جانے والی زبانوں کی تفصیلات بھی۔ یہ سب کچھ ان گزیٹیر (Gazetteer) کا حصہ تھا، جو برطانوی عہدیداروں نے مقامی لوگوں کی مدد سے تیار کیے تھے۔ یہ گزیٹیر آج بھی تاریخی اہمیت رکھتے ہیں۔ پاکستان میں نہ تو ان گزیٹیر میں کوئی اضافہ ہوا اور نہ ہی نئے گزیٹیر تیار کیے گئے۔

نوآبادیاتی دور میں سیاسی، معاشی اور سماجی بحرانوں پر سروے کرائے گئے۔ دستاویزات تیار کی گئیں۔ اب یہ سب کچھ آرکائیوز میں محفوظ ہے اور تحقیق کرنے والوں کے لیے مواد فراہم کرتا ہے۔

کلونیل ازم نے ایک ایسا سیاسی نظام نافذ کیا تھا کہ جس میں اقتدار تو ان کے پاس تھا مگر مقامی باشندے اس نظام کی گرفت میں تھے۔ آفس میں کام کرنے والے کلرک، ٹیکس جمع کرنے والے کلکٹر، پولیس کے تھانیدار اور سپاہی، یہ سب برطانوی مفادات کی حفاظت کرتے تھے۔ سازشوں اور مخالفتوں کو روکنے کے لیے CID اور مخبری کے کئی ادارے تھے۔ ان کی تمام رپورٹیں آج بھی موجود ہیں۔

کلونیل ریاست نے خود کو مستحکم کرنے کے لیے ہر شعبۂ زندگی کو کنٹرول کرنے کے لیے نئے قوانین نافذ کیے تھے۔ اخبارات اور پبلشروں کو حتیٰ کہ پمفلٹس شائع کرنے تک کے لیے حکومت سے ڈکلیریشن لینا پڑتا تھا۔ خلاف ورزی کی صورت میں پریس اور ضمانت دونوں ضبط ہو جاتے تھے۔

کلونیل ریاست نے عدلیہ کے نظام کو بھی بدل ڈالا تھا۔ اب وکیلوں کا نیا طبقہ پیدا ہو گیا تھا اور عدالتیں مقدمات پر بحث و مباحث کا مرکز بن گئی تھیں۔ اس کے علاوہ حکومت نے ہندوستان میں جیلیں متعارف کرائیں۔ جگہ جگہ نئی جیلیں تعمیر ہوئیں، جہاں شہریوں کو رکھا جاتا تھا۔ انگریز قیدیوں کے لیے جیل علیحدہ ہوتی تھی کیونکہ حکومت نہیں چاہتی تھی کہ انگریز مجرم ہندوستانی قیدیوں کے ساتھ رہیں کیونکہ اس سے ان کی 'نسلی برتری' پر برا اثر پڑتا تھا۔

ملکی انتظام کے لیے انگریز نوجوانوں کو برطانیہ میں تربیت دی جاتی تھی جو انڈین سول سروسز کا امتحان پاس کر کے آتے تھے۔ ان کا تقرر ہندوستان میں اعلیٰ عہدوں پر ہوتا تھا۔ ان کے اختیارات بہت اور تنخواہیں بھی اچھی خاصی ہوتی تھیں۔ اس لیے یہ محنت اور ایمانداری سے کام کرتے تھے۔

کلونیل ریاست نے اپنے مقاصد کے لیے تعلیم کو بھی استعمال کیا۔ خاص طور سے اسکول کی نصابی کتب میں ان ہندوستانی شخصیات کا مذاق اڑایا جاتا تھا، جنہوں نے ان کے خلاف مزاحمت کی تھی، جیسے حیدر علی اور ٹیپو سلطان۔ اس کے علاوہ طالب علموں کو حکومت انگلستان کی برکتوں کا سبق دیا جاتا تھا۔

کلونیل ریاست تقریباً تین سو سال تک حکومت میں رہی اور اس عرصے میں اس نے ایک ایسی اشرافیہ کی تربیت کی، جو اپنے رہن سہن اور اپنی زبان کے لحاظ سے انگریزوں کی نقال ہو گئی تھی۔ دوسری جانب عوام کی اکثریت پسماندگی ہی میں رہی اور ان کی زندگی میں کوئی انقلابی تبدیلی نہ آئی۔ کلونیل دور کی یہ اشرافیہ نقالی کے باعث معاشرے میں کوئی تبدیلی نہ لا سکی اور آج بھی یہ انگریزی دور کو یاد کر کے افسردہ ہو جاتی ہے۔

(بحوالہ: ''ڈی ڈبلیو ڈاٹ کام''۔ ۴ فروری ۲۰۲۴ء)

بقیہ: یوکرین: کیا یورپ حکمتِ عملی بدل رہا ہے؟

یوکرینی افواج روس کو بہت حد تک منہ توڑ جواب دے رہی ہیں۔ وہ روس کی راڈار سائٹس اور بیسز کے علاوہ کرائیمیا اور جنوبی یوکرین میں سپلائی روٹس پر ٹارگیٹڈ فضائی حملے کر رہی ہیں۔

فروری کے اوائل میں یوکرین کے کمانڈر انچیف ویلیری زیلیزونی نے امریکی نشریاتی ادارے سی این این کے لیے ایک تجزیے میں کہا تھا کہ ڈرونز اور ایسے ہی دیگر ریموٹ کنٹرولڈ ایریل وہیکلز کی مدد سے یوکرین کی فوج زمینی جنگ کے جھنجٹ سے بہت حد تک بچی ہوئی ہے۔

امریکا نے یوکرین کی کال کا جواب دیا ہے۔ فروری کے شروع سے وہ یوکرین کی فوج کو GLSDB پریسیشن بم فراہم کر رہا ہے۔ ان بموں کی مار ۱۵۰ کلومیٹر تک ہے یعنی کرائیمیا سے جنوبی یوکرین کے شہر ماریوپول تک کی ساحلی پٹی پر واقع روس کا سپلائی روٹ یوکرین کی فوج کے نشانے پر ہے۔ نکولینچ نے ڈوئچے ویلے سے انٹرویو میں کہا کہ یوکرین کو ایک سال سے امریکی ساخت کے اِن بموں کا انتظار تھا۔ اُن کے خیال میں چند ایک معاملات یوکرین کے حق میں جا رہے ہیں تاہم یہ دیکھنا باقی ہے کہ یورپی قائدین اپنی حکمتِ عملی تبدیل کرتے ہیں یا نہیں۔ حتمی تجزیے میں تو یورپی قائدین ہی کو اپنے فیصلوں کی مدد سے یوکرین کو اس قابل بنانا ہے کہ کئی سال تک روس یا کسی اور ملک کے حملوں کا سامنا کر سکے۔ (ترجمہ: ابوصباحت)

"Ukraine: Is Europe starting to change its strategy?" ("dw.com". February 13, 2024)

MA'ARIF FEATURE - Publisher:Shahid Hashmi; Printer:Hassan M.Abbasi,City Press,Karachi; Office:D-35,Block-5,F.B.Area,Karachi-75950